میری علمی زندگی

کی داستانِ عبرت

مجدّدِ ملّت حضرت
علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ

فرقانیہ اکیڈمی وقف

میری علمی زندگی

کی داستانِ عبرت

مجدد ملّت حضرت

علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ

مطبوعات فرقانیہ اکیڈمی وقف

سلسلہ مطبوعات فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ ۱۰

نام کتاب .... میری علمی زندگی کی داستانِ عبرت

نام مصنف .... علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ

ٹائپ سیٹنگ .... اویل یس، بنگلور

بارسوم ۲۰۱۸ء/ ۱۴۳۸ھ

ناشر .... فرقانیہ اکیڈمی وقف، بنگلور

مطبوعہ.......................... پرنٹوگراف، بنگلور

قیمت ....

FURQANIA ACADEMY WAQF

82, 9th F Main, BTM 1st Stage, Bangalore-560029 (India)

Tel: 080-42052967, Fax: 080-42052967

E-mail: furqania@yahoo.co.in; http://www.furqaniaacademy.com

فہرست مضامین

دوسرا باب

میری زندگی عبرتوں کا ایک مرقع

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
	تیسرا باب	
	بعض خاندانی احوال وکوائف	

حضرتؒ کے آخری ایام

الحمد لله وسلام علی عباده الذین اصطفی. أما بعد:

والد بزرگوار حضرت علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ کی یہ سوانح حیات ان بارہ تصانیف میں سے ایک ہے جنہیں آپ نے اپنی حیات کے آخری چند ماہ کے دوران مکمل کیا تھا۔ وفات سے تقریباً پانچ ماہ قبل یعنی رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ ہی سے حضرت والا کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ شدید علالت اور گوناگوں امراض سے آپ گھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں کی بینائی تقریباً معدوم ہو رہی تھی۔ مگر باری تعالیٰ کا فضل رہا کہ آپ کبھی فریش نہیں ہوئے، نہ کسی سے کچھ خدمت لی اور نہ ہی کسی پر بوجھ بنے۔ آپ بے پناہ خود اعتمادی اور قوت ارادی کے مالک تھے۔ تصنیف وتألیف میں فنائیت ہی آپ کی ساری لاعلاج بیماریوں کا حل تھا۔ آخری دم تک قلم ہاتھ میں رہا اور آپ اپنے علمی مشن کی تکمیل میں جٹے رہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی چیز کا ہوش تک نہ رہتا۔ نہ کھانے کا اور نہ ہی آرام کا۔

ٹھیک انہیں دنوں شاید حضرت والا کو اپنے وقت موعود کا اشارہ مل چکا تھا۔ آپ بارہا

اس کا تذکرہ فرما چکے تھے۔اور سوانح ہذا میں بھی جسے آپ نے انتقال سے صرف ایک دن قبل مکمل کیا تھا بہت ساری جگہوں پر اس کے واضح اشارات ملیں گے۔لہذا حضرت نے ان پانچ ماہ کے دوران جنگی پیمانے پر اپنی بے شمار ادھوری تحقیقات وتصنیفات کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔دوسری طرف اکیڈمی کی مستقل عمارت کی تکمیل کا کام بھی اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔اگرچہ عمارت کا تعمیری کام جنوری ۲۰۰۰ء سے شروع ہو چکا تھا اور ایک سہ منزلہ ڈھانچہ بھی تیار ہو گیا تھا۔مگر عمارت ابھی بھی دھیرے دھیرے تکمیل کے آخری مراحل سے گزر رہی ہے۔سارا تعمیری کام خود آپ کے منصوبہ اور پلاننگ کے مطابق اور بنفس نفیس آپ کی نگرانی میں انجام پایا۔

ادھر حضرت روزانہ نمازِ فجر سے لیکر رات بارہ بجے تک لگاتار محدب شیشہ (Magnifier) کی مدد سے تحقیق وتصنیف میں اس طرح غرق ہو جاتے کہ آپ کو امراض وتکالیف کا احساس تک نہ رہتا۔مگر جیسے ہی یہ علمی سلسلہ تھوڑی بھی دیر کے لئے رکتا بس صحت میں بگاڑ شروع ہو جاتا۔اس طرح ان پانچ ماہ کے دوران دھڑا دھڑ تقریباً ایک درجن تصنیفات طباعت کے لئے بالکل تیار ہو گئیں۔اس سے قبل حضرت کا معمول یہ رہتا کہ جب بھی کوئی نئی کتاب مکمل ہوتی تو خود اپنی نگرانی میں اس کی طباعت واشاعت کا کام انجام دیتے۔اور دوسری تصنیف شروع کرنے سے قبل چند دن آرام بھی فرما لیتے۔مگر ان پانچ ماہ کے دوران ایسا کچھ نہیں ہوا، یکے بعد دیگرے تقریباً ایک درجن کتابیں تیار ہو گئیں، نہ آپ کو انہیں چھپوانے کا خیال آیا اور نہ آرام کا کچھ موقع ہی مل سکا۔بلکہ خود بقول حضرت کے آپ کو آرام صرف قبر ہی میں مل سکتا تھا۔

سوانح ہذا سے قبل حضرت اپنی زندگی کی سب سے اہم کتاب ''قرآن عظیم کا نظام دلائل اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ'' تصنیف فرما چکے تھے۔لہذا مؤخر الذکر کتاب کے مکمل ہوتے ہی آپ نے بڑی تیزی سے سوانح ہذا لکھنی شروع کر دی اور رات دن اس میں غرق ہو گئے۔دوران

تصنیف حضرت نے فرما دیا تھا کہ یہ آپ کی زندگی کی آخری کتاب ہوگی اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی آپ کا مشن پائے تکمیل کو پہنچ جائیگا۔ اللہ اکبر! حضرت کا ادراک کتنا صحیح تھا۔ اِدھر سوانح مکمل فرمائی اور اُدھر فرمان الٰہی آن پہنچا گویا کہ رب العالمین کو بھی آپ کے مشن کی تکمیل کا انتظار رہا ہو۔ ان سطور کے اختتام پر سوانح ہذا کے مسودہ کے آخری صفحہ کی عکسی تصویر ملاحظہ ہو جس میں حضرت نے نہایت واضح الفاظ میں اس دنیائے فانی سے رخصتی کا اعلان فرما دیا ہے۔ الغرض ان دونوں کتابوں کی ترتیب طباعت حضرت کے مطابق اس طرح تھی کہ سوانح ہذا سے پہلے ''قرآن عظیم کا نظام دلائل'' شائع کر دی جائے۔ پھر اس پر اہل علم کا ردعمل دیکھنے کے بعد سوانح ہذا کا اجراء کیا جائے، کیونکہ اس سوانح کے اکثر مباحث مؤخر الذکر کتاب کا تتمہ ہیں، جیسا کہ خود حضرت نے مؤخر الذکر کتاب کے مقدمہ اول میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول مصنف یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع پر فیصلہ کن اور منکرین پر حجت پوری کرنے والی ہیں۔ مگر چونکہ اس ترتیب کی اہمیت حضرت کی زندگی میں تھی اور اب آپ کی وفات کے بعد اس کی وہ اہمیت نہیں رہ جاتی ہے، لہذا ہم نے ان دونوں کتابوں کی مشترکہ اہمیت کے پیش نظر انہیں بیک وقت شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے حضرت سوانح ہذا سے پہلے ''قرآن عظیم کا نظام دلائل'' مکمل فرما چکے تھے، لہذا سوانح کی تکمیل کے بعد آپ نے دوبارہ مؤخر الذکر کتاب پر مزید کچھ اضافہ کرنا چاہا۔ لہذا کتاب پر پہلے سے تحریر کردہ مقدمہ کو ''مقدمہ ثانی'' قرار دیتے ہوئے عین ۱۶، اپریل کی رات آپ نے انتہائی سرعت سے ''مقدمہء اول'' تحریر فرمانا شروع کر دیا۔ صحت مسلسل بگڑ رہی تھی۔ اسی حالت میں رات دس بجے تک لکھنے میں مصروف رہے اور ابھی بحث مکمل ہو نہیں پائی تھی کہ اچانک بجلی چلی گئی۔ لہذا آپ نے رات کا کھانا تناول فرمایا۔ کھانے کے بعد طبیعت میں بے قراری اور سینہ میں تکلیف کافی بڑھ گئی۔ تحریر مکمل کرنے کی بہت کوشش کے باوجود

ایسا نہ کر سکے۔ رات بھر درد سے تڑپتے رہے۔ اس کے باوجود مقدمہ کی تکمیل تک ہسپتال جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کتاب مکمل کرنے کی تڑپ اتنی شدید تھی کہ ڈیڑھ بجے رات بھی جب درد کافی شدت اختیار کر چکا تھا راقم سے کہنے لگے کہ صبح نماز فجر کے بعد مقدمہ مکمل کر لونگا، پھر شام میں ہسپتال چلیں گے، کیونکہ شاید میں وہاں سے دوبارہ گھر واپس نہ آسکوں۔ اس نازک وقت میں بھی ہمیں حضرت کی باتوں پر یقین ہونے لگا تھا کہ شاید آپ صبح مقدمہ پورا کر دینگے۔ خصوصاً حضرت کی حیات کے آخری پانچ ماہ آپ کی بے مثال قوت ارادی پر شاہد ہیں کہ بارہا شدید تکالیف کے باوجود آپ لکھنے میں اسقدر غرق ہوجاتے کہ سارے درد اپنے آپ غائب ہوجاتے۔ مگر اس دن ایسا نہ ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے درد ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ جب لاکھ کوششوں کے باوجود آپ مقدمہ مکمل نہ کر سکے تو صبح (۱۷، اپریل) مجبوراً ہسپتال جانے کے لئے تیار ہوتو گئے، مگر اسوقت بھی ہمت نہ ہاری اور اپنے چھوٹے فرزند برادرم مولوی انیس الرحمٰن ندوی سے کہا کہ اس ادھورے مقدمہ کو فوراً کمپوز کر کے ہسپتال لے آؤ، وقت ملنے پر اسے مکمل کرونگا۔

ہسپتال روانہ ہونے سے قبل جامع وصیت فرمائی اور راقم سطور کے علاوہ اپنے دیگر دو چھوٹے بیٹوں حافظ مولوی جمیل الرحمٰن ندوی اور مولوی انیس الرحمٰن ندوی تینوں سے بیعت لی کہ ہم پوری ذمہ داری سے اکیڈمی کو قائم ودائم رکھیں گے۔ والد ماجد نے یہاں تک کہہ دیا کہ ورنہ قیامت کے دن میں تم تینوں کا گریبان پکڑونگا۔ ہماری بیعت اور یقین دہانی سے جب آپ کو اطمینان ہوا تو تمام گھر والوں سے فرداً فرداً مصافحہ کیا، وداعی لی اور پھر ہسپتال کی راہ لی۔ صبح ۱۰ بجے جیسے ہی ہسپتال پہنچے صحت اتنی بگڑ چکی تھی کہ فوراً آپ کو I.C.U میں بھرتی ہونا پڑا۔ خون کا دباؤ خطرناک حد تک کم ہوگیا تھا۔ لمبی مدت سے بے قابو ذیابیطس کی وجہ سے گردے بھی کافی متاثر ہوچکے تھے، نتیجہ جسم میں سیال مادہ کی کافی زیادتی ہوگئی تھی، جس کی وجہ سے طبیعت کافی بوجھل

اور نڈھال ہوگئی تھی۔ دل کے معائنہ کے بعد ڈاکٹروں نے پتہ لگایا کہ ماضی قریب میں دل کا دورہ بھی پڑھ چکا ہے، مگر ذیابیطس کی وجہ سے اس کا احساس نہ ہوسکا۔ لہذا ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹروں نے ہمہ جہتی علاج شروع کردیا۔ رات دس بجے تک بھی حضرت والا پورے ہوش وحواس میں رہے اور بات چیت بھی معمول کے مطابق کرتے رہے۔ سنجیدگی اور متانت میں تھوڑا بھی فرق نہ آیا۔ اور بے چینی کے باوجود ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔ ہاں البتہ I.C.U کی پابندیوں سے بہت کڑھن محسوس کررہے تھے، اور مطالبہ بھی کررہے تھے کہ ہسپتال سے خارج ہوکر واپس گھر ہی چلے چلیں گے۔ رات کا کھانا راقم ہی نے اپنے ہاتھوں سے کھلایا۔ پھر دیر رات جب سانس لینے میں کچھ تکلیف ہونے لگی تو فوراً مصنوعی نظام تنفس (ventilator) سے مدد لینی پڑی اور ساری رات مدہوشی کے عالم میں سکون واطمینان سے گزری۔ صبح ۷ بجے (۱۸، اپریل) تک بھی صحت میں کوئی خاطر خواہ بگاڑ نہیں آیا اور سب ٹھیک ٹھاک چل ہی رہا تھا کہ اچانک ۷:۲۰ بجے صحت خطرناک رفتار سے بگڑنے لگی اور دل کی دھڑکن یک لخت کم ہوگئی۔ راقم سطور اور اس کے بڑے بھائی مولوی شفیق الرحمٰن دونوں والد بزرگوار کے پائینتے کھڑے دست بدعا تھے، کہ ٹھیک صبح ۷:۳۰ بجے دھڑکن صفر تک پہنچ گئی اور آپ عالمِ ناسوت سے عالم بقاء کی طرف کوچ کرگئے۔ ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.﴾

مرتے دم تک حضرت والا قوم کی اور خصوصیت کے ساتھ خواص ملت کی قرآن حکیم سے بے اعتنائی پر کڑھتے رہے، اور اکثر آپ کی آنکھیں غم سے اشک بار ہوجاتی تھیں۔ راقم سے اکثر اس موضوع پر گھنٹوں تبادلہء خیال فرماتے۔ ان کا حزن وملال اس عاجز سے دیکھا نہ جاتا۔ اکثر ﴿ إِنَّمَآ أَشْكُوْبَثِّىْ وَحُزْنِىٓ إِلَى اللّٰهِ﴾ (میں تو اپنی پریشانی اور غم کا اظہار اللہ ہی کے سامنے کرتا ہوں) کا ورد فرماتے۔ آپ نے زندگی کے کسی بھی میدان میں کوئی امر نامکمل نہیں

چھوڑا، نہ علمی اور نہ ہی خانگی۔ آخری چند دنوں میں آپ نے سارے علمی کام ہمیں اس طرح سمجھا دیے تھے گویا کہ آپ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو رہے ہوں۔ اکیڈمی کے تمام انتظامی امور بھی خوب ذہن نشین کروادیے۔ خانگی امور میں بھی کوئی امر تشنہ نہ چھوڑا۔ ایک عارف باللہ وداعی الی اللہ کا یہ ایمان افروز اور قابل رشک انجام یقیناً آپ کے مساعیٔ جمیلہ وحسنہ کی عنداللہ مقبولیت کی بین دلیل ہے۔ اللہ تعالی حضرت کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے، آپ کی اس عظیم تحریک کو بارآور فرمائے، انہیں اعلی علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں آپ کے مشن کی تکمیل کرنے اور آپ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی توفیق وصلاحیت عطا فرمائے، آمین!

حضرت کی پہلی نماز جنازہ اسی دن یعنی ۱۸، اپریل کو بعد نمازِ عصر اپنے محلے کی مسجد میں خود راقم نے پڑھائی۔ دوسری نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب میرے چھوٹے بھائی مولوی جمیل الرحمٰن ندوی نے اپنے آبائی وطن چک باناور (مضافاتِ بنگلور) میں پڑھائی، اور آپ کو یہیں اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً. فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ. وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ.﴾

سعید الرحمٰن ندوی

ناظم، فرقانیہ اکیڈمی

یکم مئی ۲۰۰۲ء

حضرت علامہ مرحوم کی آپ بیتی کے آخری صفحہ کا عکس جسے حضرت نے اپنی وفات سے صرف ایک دن قبل تحریر فرمایا تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

نحمده ونصلّی علی رسوله الکریم.

میری زندگی ایک ایسی موج متلاطم رہی ہے جسے کبھی قرار یا ٹھہراؤ نصیب نہ ہوا ہو۔ میں ہمیشہ طوفانی موجوں سے کھیلتا اور مُہم جوئیوں میں مصروف رہا ہوں۔ اور مجھے بچپن سے لے کر آج تک کبھی چین وقرار میسّر نہیں ہوسکا ہے۔ تلاطم خیزیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ہمیشہ مجھے ایک تنکے کی طرح بہالے جانے کے درپے رہا ہے۔ لیکن بندہ ہمیشہ ان مخالف سمت طوفانوں سے لڑتے ہوئے اپنی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ اور یہ سب کچھ بفضل الٰہی فہم قرآن اور فکر قرآن کی برکت سے ہوا کہ بندہ سخت مشکل حالات اور قسم ہا قسم کی آزمائشوں کے بھنور سے باہر نکلنے میں فلاح یاب رہا۔ پچھلے پچاس سالہ عرصے میں قرآن عظیم ہمیشہ میرے ساتھ رہا اور میں اس صحیفہء حکمت کو اپنے سینے سے چمٹائے ملّت کی اندھیری گلیوں کو روشن کرنے کی غرض سے دیوانہ وار بھٹکتا رہا۔ کیونکہ میں نے مسلسل کھوج اور جدوجہد کے باعث صحیفہء الٰہی کے سربمہر خزانے کو کھولنے کی چابی دریافت کرلی۔ اور اس کے اندرون کا نظارہ کرکے میری آنکھیں

خیرہ ہوگئیں تو میں نے یہی نظارہ پوری اُمت کو کرانے کے لئے کمر کس لی، تاکہ وہ کلام الٰہی کی تجلّیوں سے فیض یاب ہوکر اپنی زندگی میں سُدھار لاسکے اور اپنی پستی سے اوپر اُٹھنے کی تدبیریں کرسکے۔ چنانچہ ۱۹۷۰ء سے لے کر آج تک بندہ قرآنی فکر اور اُس کی تحریک سے اہل اسلام کو روشناس کرانے کے مشن میں لگا ہوا ہے اور اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈال کر اس جہادِ عظیم کو کامیاب بنانے کی راہ میں سردھڑ کی بازی لگادی ہے۔ کیونکہ کسی قوم وملّت کی اجتماعی ذہنیت کو بدلنا ایک جُوئے شِیر لانے سے کچھ کم نہیں ہے۔

اس بندۂ ناتواں میں یہ فکر اور یہ حوصلہ کس طرح پیدا ہوا؟ اس کی ایک لمبی کہانی ہے، جو آپ کو اس کتاب کے اندر ملے گی۔ اس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قوموں کا ہر دور میں ایک ''تقلیدی'' مزاج ہوتا ہے، جو ایک قومی ورثے کے طور پر اُسے ملتا ہے اور وہ اُسے مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑ لیتی ہے۔ اور پھر زمانے کے نئے حالات اور نئے تقاضوں کے باعث اس قومی ورثے سے اُسے ہٹا کر نئی ڈگر پر لانا ایک انتہائی مشکل اور کٹھن کام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقلید پسند لوگ کسی بھی ''نئی بات'' کو سننے اور سمجھنے کے روادار تک نہیں ہوتے۔ اور یہ بات اس حیثیت سے صحیح ہے کہ ہمارا رشتہ ہمارے اسلاف سے قائم رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہم اس موقف کی بنا پر عصری تقاضوں سے پوری طرح آنکھیں بند کرلیں اور اپنے گرد وپیش کے حالات اور نئے فکری، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی طوفانوں یا چیلنجوں کو یکسر نظرانداز کرکے اپنے حصاروں میں بند ہوجائیں۔ قرآن اور حدیث میں اس قسم کی تعلیم کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا ہم کو اپنے اسلاف اور جدید تقاضوں کے درمیان توازن قائم رکھنا پڑے گا۔ یہی ایک صحیح اور صائب طریقہ ہے۔ اور اس حیثیت سے قرآن اور حدیث ہماری پوری پوری مدد اور رہنمائی کرتے ہیں۔ مگر تقلید پسندوں کی سمجھ میں یہ بات مشکل ہی سے آسکتی

ہے۔اسی لئے بندہ کواس راہ میں ناکوں چنے چبانے پڑ رہے ہیں اوراپنا سارازور صرف کر دینے کے باوجوداس راہ میں پوری طرح کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ہے۔مگر اتنا ضرور ہوا ہے کہ بعض بڑے بڑے اور سنجیدہ قسم کے علماء میری باتیں ذرا دھیان سے سُن رہے ہیں۔اس بنا پر اُمید ہے کہ کبھی نہ کبھی یہ ''کفر'' ضرور ٹوٹے گا۔مگر بندہ کو حقیقی خوشی اُس وقت ہوگی جب ارباب مدرسہ اس تحریک کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے نصاب تعلیم میں مناسب تبدیلیاں کریں، تاکہ وہ عصری ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق چل سکیں اور قوم وملت کو''پس ماندگی'' کی سطح سے اوپر اُٹھا سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جو قوم عصری علوم ومسائل سے ناطہ توڑ لے گی وہ اپنی خودکشی آپ کرلے گی۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآن حکیم ہی ہمارا رہنما اور قاضی ہے، جو جدید سے جدید تر تمام علوم ومسائل سے بھرا ہوا ہے۔اور ہر نئے مسئلے میں قول فیصل صادر کر رہا ہے۔مگر اس بارے میں اُمت کے درمیان افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن کے اس پہلو کی بنا پر بعض لوگ اسے محض سائنس کی کتاب قرار دے کر مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ شریعت کو الوداع کہہ کر صرف سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کریں، اور اُن کی نظر میں حقیقی اسلام یہی ہے۔اور اس صدا کے داعی بیسویں صدی کے وسط میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے''دو قرآن'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کر کے علمی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔اس کتاب نے عوام کو بہت زیادہ متاثر کیا۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک قلیل عرصے میں اس کے بہت سے ایڈیشن نکل گئے۔ کیونکہ مصنف کتاب کا اُسلوب بڑا ہی دلکش اور زوردار تھا۔اور اُنہوں نے نظام کائنات کے سلسلے میں وارد بہت سی آیات کو جمع کر کے قرآن کو پوری طرح سائنس کی کتاب ثابت کرنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔اور اس سلسلے میں اُن کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک قرآن وہ ہے جو تحریری شکل میں موجود ہے اور دوسرا قرآن وہ ہے جو مظاہر کائنات کے رُوپ میں پایا جاتا ہے۔اور پھر اُنہوں

نے اپنی اس تعبیر کے لئے قرآنی آیات کو نہ صرف توڑ مروڑ کر پیش کیا بلکہ معنوی اعتبار سے اُن کی تحریف کرنے سے بھی نہ چوکے۔ اور دوسری طرف اُنہوں نے سائنس دانوں کو قرآن کے حقیقی مفسرین قرار دے کر علماء کی توہین تک کرنے کی بھی جسارت کر ڈالی تھی۔

اس کتاب کے جواب میں بعض علماء نے کتابیں لکھیں، جن میں ایک حضرت مولانا قاری طیبؒ کی "ایک قرآن" بھی ہے۔ مگر یہ جوابی کتابیں محض دفاعی موقف کی تھیں اور برق نے جو سوالات اُٹھائے تھے اُن کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ قرآن حکیم میں سائنسی علوم و مسائل کا تذکرہ کیوں اور کس لئے کیا گیا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اسلام اور سائنس میں کیا تعلق ہے؟ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس کتاب نے علمی حلقوں کو شدید طور پر جھنجوڑ کر رکھ دینے کے باوجود کسی نے اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی زحمت بھی نہیں کی، گویا کہ کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ اس کتاب کو منظر عام پر آئے ہوئے تقریباً ساٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اور موضوع کسی بھی طرح نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ کتاب الٰہی نوع انسانی کی ہدایت کی غرض سے نازل کی گئی ہے۔ لہذا سوال یہ ہے کہ اگر اس علم کا تعلق ہدایت سے نہیں ہے تو پھر آخر کتاب الٰہی میں اس کا تذکرہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ بات بیکار یا بلا مقصد نہیں ہوسکتی۔ اور باریٔ تعالیٰ اس قسم کے فعل عبث سے بالکل پاک اور بری ہے کہ وہ خواہ مخواہ اور بلا وجہ اہل ایمان کو کسی قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا کر دے، معاذ اللہ۔

ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کوئی معمہ یا چیستان نہیں ہے، بلکہ ایک واضح اور غیر پیچیدہ کلام ہے، جیسا کہ خود اُس نے اپنا تعارف کرایا ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ کتاب اللہ میں اس قسم کی آیات (نظام کائنات سے متعلق) دو چار جگہ نہیں بلکہ اُسلوب بدل بدل کر سیکڑوں

مقامات پر مذکور ہیں۔ اور امام غزالیؒ کی تحقیق کے مطابق ان کی تعداد ۷۶۳ ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحقیق کے مطابق یہ ایک مستقل علم ہے، جسے موصوف نے قرآن کے پانچ بنیادی علوم میں سے ایک قرار دیا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ علماء کرام نے قرآن کے اس بنیادی علم سے جو ۷۶۳ آیات پر مشتمل ہے بے اعتنائی کیوں برت رکھی ہے؟ کیا اُن کا فرض نہیں ہے کہ وہ پورے قرآن کو سمجھیں اور اُس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو تلاش کریں؟ جب کتاب الٰہی سے بے تعلقی کا یہ عالم ہو تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی مدارس میں طلبہ کو کیا پڑھایا جاتا ہے اور ان ۷۶۳ آیات کی تفسیر کیا کی جاتی ہے؟ کیا باری تعالیٰ نے زمین، آسمان اور ان دونوں میں موجود مظاہر کو محض ''گھور کر'' دیکھنے یا اُن پر ایک اچٹی سی نظر ڈال کر آگے بڑھ جانے کا حکم دیا ہے؟ ڈاکٹر برق کو چھوڑیئے، اُن کا بنیادی نقطۂ نظر حد درجہ گمراہ کن ہے، مگر اُنہوں نے جو بنیادی سوالات اُٹھائے ہیں اُن کا کیا جواب ہے؟ کیا ساٹھ سال کا عرصہ کوئی معمولی عرصہ ہے؟ جب کتاب الٰہی سے لاتعلقی کا یہ عالم ہو تو پھر دین کی سمجھ (تفقہ فی الدین) کا کیا مطلب ہے؟ حالانکہ رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق اہل اسلام کو قرآن اور حدیث کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنے کی تاکید کی گئی ہے، تو کیا آج کے مسلمان ارشاد نبوی پر عمل کر رہے ہیں؟ اگر نہیں کر رہے ہیں تو پھر اس میں قصور کس کا ہے اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ علمائے کرام کو ان تمام سوالات کا جواب دینا چاہیئے۔ اگر وہ بدستور خاموشی اختیار کر لیں تو پھر اُن کا علمبرداران اسلام ہونے کا دعویٰ بیکار ہے۔

اور اس مسئلے پر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے غور فرمائیے: نظام کائنات کے بارے میں قرآن حکیم میں جو بے شمار آیات موجود ہیں اگر ان کا کوئی خاص مقصد نہ ہو تو پھر جگہ جگہ ان کے تذکرہ کے سلسلے میں اہل اسلام سے اس طرح کیوں مخاطب کیا گیا ہے۔ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

(تا کہ تم سمجھ سے کام لو)، ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ﴾ (تا کہ تم غور کر سکو)، ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (تا کہ تم متنبہ ہو سکو) وغیرہ وغیرہ۔ تو کیا حاملین قرآن نے اس قسم کی آیات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا ہے اور دلائل رُبوبیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ لہٰذا اب مزید خاموشی ان کے لئے حرام ہے۔

ڈاکٹر برق کی یہی وہ کتاب ہے جس نے راقم کو اس موضوع پر غور کرنے اور ایک سنجیدہ تحقیق پر آمادہ کیا۔ چنانچہ قرآن اور سائنس کے صحیح تعلق کا پتہ لگانے میں بندہ کو پورے بیس سال تک تحقیقی مطالعہ کرنا پڑا۔ اور پھر ۱۹۷۰ء میں فرقانیہ اکیڈمی کے قیام کے بعد سے لے کر اب تک سیکڑوں مضامین اور بہت سی کتابیں تحریر کر چکا ہوں اور اس سلسلے کے قرآنی حقائق و معارف پر پورے دلائل کے ساتھ روشنی ڈال چکا ہوں، جن کی بہت سے اہل نظر حضرات نے تعریف وتوصیف کی ہے، مگر عربی مدارس ابھی تک ٹس سے مس نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے یا تو میرے دلائل و براہین کو، جو قرآن اور حدیث کے مطابق ہیں، پوری طرح نظر انداز کر دیا ہے یا پھر وہ تذبذب کے عالم میں ہیں کہ ان حقائق کی تصدیق کریں یا نہ کریں؟ حالانکہ قرآن ایک صاف وصریح کلام ہے، کوئی معمہ یا چیستان نہیں۔

بہر حال ملت کے ناخدا جب تک اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے اس ''کڑوے گھونٹ'' کو حلق کے نیچے نہیں اُتاریں گے ملت اسلامیہ کا بھلا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سائنسی علوم کا تعلق نہ صرف دلیل واستدلال سے ہے بلکہ اُس کا تعلق خلافتِ ارض سے بھی ہے اور ان حیثیتوں سے یہ علوم آج اس اُمت کی نشأۃ ثانیہ کے لئے بہت ضروری ہیں۔ ڈاکٹر برق نے اس بنیادی حقیقت کو دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کر کے قرآن کو محض سائنس کی کتاب قرار دینے پر اپنا سارا زور صرف کر دیا۔ حالانکہ قرآن میں سائنسی علوم کا تذکرہ اصلاً دلائل رُبوبیت کو اُجاگر کرنے

کی غرض سے ہے، جو مظاہر عالم میں غور وفکر کے باعث ظہور میں آتے ہیں۔ اوران مظاہر میں غور وخوض کے باعث جو نیا علم وجود میں آیا ہے اُس کا نام سائنس ہے۔ جسے ہمارے قدیم علماء ''تکوین'' (خلق وایجاد) کہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم درحقیقت ''کتابِ رُبوبیت'' ہے، جیسا کہ اُس کی پہلی سورت کی پہلی ہی آیت کریمہ سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے، جس کے مطابق باریٔ تعالیٰ کو ''ربّ العالمین'' کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ یعنی اس کائنات میں جتنے بھی مظاہر ومخلوقات ہیں اُن سب کا رب۔ چنانچہ رُبوبیت کی یہ تفصیلات پورے قرآن میں مختلف حیثیتوں سے کہیں اشاروں کنایوں میں اور کہیں پر کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہیں، جو دراصل دلائل رُبوبیت کی نوعیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اور یہ دلائل (نظام کائنات میں موجود خدا کی نشانیاں) مظاہر کائنات اور اُن کے نظاموں میں پوری طرح سمودئے گئے ہیں (کیونکہ خلاق عالم نے انہیں حد درجہ حکمت ومنصوبہ بندی کے ساتھ پیدا کیا ہے) لہٰذا ان دلائل کی تحقیق کے لئے مظاہر کائنات کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔ اوراس تفصیلی مطالعے سے قرآن حکیم میں مذکور وہ تمام اشارات وکنایات ''معنی خیز'' بن جاتے ہیں جو دلائل رُبوبیت سے متعلق ہیں۔ اوراس کے نتیجے میں باریٔ تعالیٰ کے ''ربّ العالمین'' ہونے کی حقیقت پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے، جو ہر قسم کے کفر وشرک اور الحاد ودہریت کے خلاف ایک بُرہان قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے قرآن ایک متن ہے، جس کی شرح وتفصیل یہ پوری کائنات ہے۔ اوران دونوں میں کوئی تعارض وتضاد نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے مصدّق ومؤید ہیں۔ اوران دونوں کی تطبیق سے ہر قسم کی فکری گمراہیوں کا استیصال ہوجاتا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی چشمے سے صادر شدہ ہیں۔

یہ ہے وہ اصل وجہ جس کی بنا پر قرآن عظیم کو ہر قسم کے علوم وفنون سے آراستہ کیا گیا

ہے، تاکہ وہ ہر دور کے علمی و عقلی چیلنجوں کا جواب دے کر دلیل و استدلال کے میدان میں باطل افکار اور لادینی فلسفوں کا مقابلہ کر کے باریٔ تعالیٰ کی حجت پوری کر سکے۔

نیز اس سلسلے میں ایک تیسری حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے عصری علوم یا ''تحقیقات جدیدہ'' کے پیشِ نظر جب قرآنی حقائق و معارف میں غور کیا جائے تو اس سے نہ صرف قرآن عظیم کا علمی اعجاز ظاہر ہو جاتا ہے بلکہ ان دونوں کے ''تقابل'' سے جدید مسائل کا حل بھی مل جاتا ہے، جو ایک حیثیت سے فکر و نظر کے اندھیریوں کو روشن کرنے کے سلسلے میں ''قندیل راہ'' کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسری طرف وہ ''اجتہادی قوتوں'' کو اُبھارتا اور انہیں جلا بھی دیتا ہے۔ ان تمام اعتبارات سے جدید علوم کسی قوم کے لئے (اور خاص کر اُمت مسلمہ کے لئے) پیام حیات اور آب حیات کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے کنارہ کشی کسی زندہ قوم کے لئے پیام موت بن جاتے ہیں اور وہ زمین پر اپنی معنویت پوری طرح کھو بیٹھتی ہے، جس میں ''خیر'' کا کوئی پہلو نہ رہ گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُمت مسلمہ بحیثیت مجموعی ان مفید علوم سے (جن کی حیثیت خلافت ارض کی ''چابیوں'' کی طرح ہے) چھوت چھات برت کر اپنے آپ کو خلافت ارض کے میدان سے تقریباً باہر کر چکی ہے اور اُن پر ذلت و مسکنت طاری کر دی گئی ہے۔ کیونکہ اُس نے ''آیات الٰہی'' کی ندائے غیبی پر کان دھر کر ان کے تقاضوں پر عمل کرنے سے صاف ''انکار'' کر کے گویا کہ اپنے کانوں میں رُوئی ٹھونس لی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اب زوال و انحطاط کے آخری سرے پر پہنچ کر کفر و شرک اور الحاد و دہریت کے طوفانوں میں گھر گئی ہے، جو چاروں طرف سے اُسے گھیرے میں لے چکے ہیں اور ہر طرف افراتفری اور ہاہاکار مچی ہوئی ہے۔ مگر حیرت و عبرت کی بات ہے کہ ملت کے ناخدا زوال اُمت کا حقیقی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر ملت کے دکھوں کا مداوا کرنے کے بجائے حیران و پریشان ایک دوسرے کا مُنہ تک رہے ہیں اور اس نئی اُفتاد کا علاج کسی کی سمجھ

میں نہیں آ رہا ہے۔ حالانکہ علاج بالکل ہمارے سامنے موجود ہے، جو ہمارے لئے ''نسخۂ شافی'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر ہم نے اسے ایک ''پُرانی'' کتاب قرار دے کر طاقِ نسیاں کر رکھا ہے۔ اور یہ وصف عوام کا نہیں بلکہ ارباب ملت کا ہے، جو قرآن عظیم کو اس طرح نظرانداز ہی نہیں بلکہ اُسے پامال کر کے دنیا میں ''شان وشوکت'' کے ساتھ جینے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جب کہ مسلمانوں کی زندگی قرآن کی ''زندگی'' میں ہے۔ قرآن کو آپ ''ٹھنڈے بستے'' میں ڈال کر عروج ملت کا خواب کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اللہ اور اُس کے رسول کا فیصلہ ہے۔ لہذا اگر مسلمانوں کو عزت اور وقار کے ساتھ جینا ہے تو پھر کتاب الٰہی کو اوپر اُٹھانا ہوگا۔ یہ کاتب تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا۔

غرض یہی وہ حقائق ہیں جو بندہ گزشتہ ۳۰-۳۲ سال سے علمی دنیا کو مسلسل اور مختلف اندازوں میں سمجھا رہا ہے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اب سفر آخرت کی تیاری میں مصروف ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر بات ملّت کے ناخداؤں کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو پھر بندہ ان کے حق میں سوائے ''فاتحہ خوانی'' کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اب اس فقیر حقیر کا مشن پورا ہو چکا ہے۔ اور اس سلسلے میں میں نے بعض معرکے کی کتابیں تصنیف کر دی ہیں، جن میں سے ایک ''قرآن عظیم کا نظام دلائل اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ'' بھی ہے۔ اور یہ کتاب میں نے خاص کر علمائے اسلام پر خود قرآن عظیم کی حجت ثابت کرنے کی غرض سے لکھی ہے۔ کیونکہ اب میری نظر میں نوع انسانی پر حجت پوری کرنے سے پہلے خود علمائے اسلام پر حجت پوری کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ قوم ہے جو اگر سیدھی ہوگئی تو پھر پوری ملت سیدھی ہو جائے گی۔

بندہ اس وقت اپنی داستان عبرت سُنانے بیٹھا ہے۔ مگر اپنی رام کہانی سنانے کے

بجائے قرآن کی باتیں سنا رہا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میری داستان قرآن کی داستان سے الگ نہیں ہے۔ نصف صدی پہلے جب میں قرآن کا ہو گیا تو اب میری کوئی نجی حیثیت نہیں رہ گئی ہے۔ بلکہ اپنا سب کچھ اُس پر نچھاور کر کے قرآنی فکر اور اُس کی تحریک کو آگے بڑھانے میں صرف جدوجہد ہی نہیں کی بلکہ حقیقی معنوں میں جہادِ عظیم کر کے اپنی منزل مقصود تک پہنچ چکا ہوں۔ مگر اس پر مجھے کوئی فخر نہیں بلکہ یہ میرے لئے باعث سعادت ہے کہ بندہ نے اس راہ میں وسعت بشری کی ''آخری حدوں'' تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہر منزل میں قرآن ہی میرا ساتھی اور قرآن ہی میرا راہبر رہا ہے بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ ہر کٹھن منزل اور ہر مشکل مرحلے میں صحیفہء الٰہی نے مجھے کبھی پیچھے ہٹنے نہیں دیا، بلکہ وہ ہمیشہ آگے بڑھنے ہی کی شہہ دیتا رہا۔ ورنہ میری کیا مجال تھی کہ اس ہفت خواں کو سر کر سکتا۔

غرض بندہ نے بفضل الٰہی اُس کی کتاب ابدی و سرمدی میں مسلسل غور و خوض کے باعث اسلامی فکر و فلسفے کے نہ صرف بہت سے مسائل حل کر لئے ہیں بلکہ اس راہ میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے چند اُصول و کُلیّات بھی وضع کر لئے ہیں جو دلیل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کلامیات قرآن پر جدید سائنسی حقائق و اکتشافات کی روشنی میں کام کر کے قرآنی اسرار و عجائب کو واشگاف کرنے کے چند جدید ''تفسیری اُصول'' بھی دریافت کر لئے ہیں۔

﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ.﴾

بہرحال یہ قرآن سے عشق ہی کا نتیجہ تھا کہ بندہ اس راہ کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کرتے ہوئے ایک شاندار ادارہ ''فرقانیہ اکیڈمی'' کے نام سے قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ اور اس کی مطبوعات کی تعداد عنقریب سو تک بلکہ اس سے زیادہ ہو جائے گی، جو اردو کے علاوہ عربی اور انگریزی زبانوں میں بھی ہیں۔ اور ان سب کی تفصیل آپ کو کتاب میں ملے گی۔

میری علمی زندگی کی داستانِ عبرت

اس کتاب میں بعض تلخ حقائق کا تذکرہ اور بعض کڑوی باتیں بھی موجود ہیں جو ملت کی اصلاح اور تعمیر نو کی غرض سے ہیں۔ اور وہ تنقید برائے تنقید کے طور پر ہرگز نہیں ہیں۔ لیکن اگر پھر بھی یہ حقائق بعض لوگوں کو کڑوے معلوم ہوں تو بندہ معافی کا خواستگار ہے۔ ﴿إِنْ أُرِيْــــدُ إِلَّا الْإِصْلاَحَ مَا اسْتَطَعْتُ.﴾

آخر میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ارباب حل وعقد سے مخلصانہ گزارش ہے کہ ندوۃ العلماء چونکہ قدیم وجدید میں ملاپ اور اصلاح نصاب کا داعی وعلمبردار رہا ہے، لہٰذا اُسے سب سے پہلے میری اس تحریک کا سنجیدہ نوٹس لینا چاہئے۔ اور سائنسی علوم کو پھر سے ندوہ کے نصاب تعلیم میں شامل کر کے دوسرے مدرسوں کو بھی تقلید کا ایک موقع دینا چاہئے۔ چنانچہ بندہ نے اب سے ٹھیک چار سال پہلے ۱۹۹۸ء میں ندوۃ العلماء میں سائنسی علوم کی اہمیت پر تین لیکچر دئے تھے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا سید رابع صاحب ندوی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ سائنسی علوم کو دوبارہ شامل نصاب فرمائیں۔ مگر مجھے نہیں معلوم کہ یہ علوم شامل نصاب ہوئے یا نہیں؟ اگر نہیں ہوئے ہیں تو للہ انہیں شامل کر کے ملت اسلامیہ کو ایک نئی راہ دکھانے کی کوشش فرمائیں۔ اسی طرح دیگر ارباب مدرسہ سے بھی مخلصانہ طور پر گزارش ہے کہ وہ وقت کی رفتار کے پیش نظر بلا تاخیر ان علوم کو شامل نصاب کر کے ملت کے تن مُردہ میں نئی جان پھونکنے کا عزم فرمائیں۔ تا کہ اس ملت کے درد کا درماں ہو سکے اور وہ پھر سے تندرست ہو کر کارِ خلافت کی باگیں سنبھال سکے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ میری اس حقیر سی جدوجہد کو بارآور فرمائے آمین۔

بندۂ ناچیز

محمد شہاب الدین ندوی

پہلا باب:

میری علمی زندگی کی داستانِ عبرت

نصف صدی کے علمی جہاد پر ایک نظر

فہم قرآن کی راہ میں

راقم نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنی پوری زندگی قرآن عظیم کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور تحقیقی مطالعہ کر کے اُس کے اَسرار و حقائق کا پتہ لگانے میں وقف کر دی کہ اس سلسلے میں کتاب اللہ کا حقیقی منشا و مقصد کیا ہے؟ یعنی کتاب الٰہی میں سائنسی علوم و مسائل کا تذکرہ کیوں اور کس لئے کیا گیا ہے؟ اور اس راہ میں بندہ کو غور و فکر اور تحقیقی مطالعہ کرنے اور اپنے نتائج فکر یہ سے دوسروں کو واقف کرانے کی جد و جہد میں پورے پچاس سال بیت چکے ہیں۔ اور یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے راقم بہت ہی مختصر طور پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے، تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس مُہم جوئی میں بندہ کو کس قدر مشقتوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر میرے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش پیدا نہ ہوئی بلکہ میں اکیلا ہی پورے عزمِ مُصمّم کے ساتھ اس میدان میں آگے بڑھتا رہا۔ مجھے قرآن اور سائنس کے درمیان ربط و تعلق کا پتہ لگانے میں تقریباً بیس سال صرف کرنے

پڑے اور پھر ۳۳ سال سے ان دونوں کے حقائق و معارف سے اُمت کو آگاہ کرنے میں جٹا ہوا ہوں۔ اور اس سلسلے میں خاص کر اُمت کے درمیان ان دونوں کے تعلق سے پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی راہ میں بہت سے مضامین اور کتابیں بھی تحریر کر چکا ہوں۔ مگر اس کے باوجود اب بھی اہل علم کی غلط فہمیاں پوری طرح دور نہیں ہوئی ہیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں میرے پیش کردہ دلائل سے وہ پوری طرح متاثر نہیں ہو سکے ہیں۔ بلکہ وہ میری باتوں کو شاید کسی مجذوب کی بڑ تصور کرتے ہوں گے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوا کہ بندہ اس سلسلے میں اپنی زندگی کی چند جھلکیاں پیش کر دے جو اپنے اندر کافی اسباق و بصائر رکھتی ہیں کہ راقم اس میدان میں کیوں اور کیسے داخل ہوا اور اُس نے اس راہ میں کیا پایا اور کس طرح پایا؟ چنانچہ سب سے پہلے میں اپنے علمی سفر کے پس منظر پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔

میری پیدائش شہر بنگلور کے مضافات میں بمقام ''چک باناور'' یکم رجب ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء میں ہوئی۔ اسکول کی تعلیم معمولی اردو اور انگریزی تک محدود تھی۔ مگر گھریلو ماحول کی بنا پر دینی کتابوں کے مطالعے کا بہت زیادہ شوق و شغف تھا۔ اور گھر میں کتابوں کا کافی ذخیرہ بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ نئی نئی کتابوں کی آمد بھی رہتی تھی۔ اور یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء تک اسی طرح چلتا رہا۔ جب کہ اس دوران ایک ایسی کتاب ہاتھ لگی جس نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل دیا اور مجھے ایک سنجیدہ علمی تحقیق پر آمادہ کر کے قرآن عظیم کے سربمہر خزانے کو کھول کر اسے وقف عام کرنے کی راہ دکھا دی۔ میری مراد ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب ''دو قرآن'' سے ہے، جو ایک لحاظ سے قابل تنقید اور دوسرے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ جہاں تک اس کے قابل تعریف ہونے کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ اہل اسلام کو ایک نئے موضوع سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اور جہاں تک اس کے قابل مذمت ہونے کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ موصوف

نے قرآن کو ایک خالص سائنس کی کتاب قرار دے کر اسلامی شریعت کا پوری طرح انکار کر دیا ہے، کیونکہ وہ اصلاً منکرِ حدیث تھے۔ اگر وہ اپنی بات علمی متانت کے ساتھ پیش کرتے تو اس سے اچھے نتائج ضرور نکل سکتے تھے۔

تفقہ فی الدین کی راہ میں

بہر حال اس کتاب نے میرے ذہن و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور طبیعت بے چین ہوگئی کہ اب قرآن کی اصلیت کا پتہ لگانا چاہئے کہ آخر وہ ہے کیا؟ اس دور میں راقم سائنس کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا، اگرچہ قرآن کا مطالعہ اردو تر جموں کی مدد سے ضرور کیا کرتا تھا۔ پھر اس کے بعد اردو زبان میں کچھ تفسیریں اور بعض دیگر کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ شروع کر دیا کہ پہلے قرآن کو سمجھا جائے پھر اُس کے بعد سائنس کی طرف توجہ کریں گے۔ مگر جب سال دو سال کی محنت سے کچھ پلے نہیں پڑا تو عربی زبان کی تحصیل کی فکر دامن گیر ہوئی تو عربی زبان کی کچھ ابتدائی کتابیں منگوا کر بغیر استاذ کی مدد کے پڑھنی شروع کر دیں۔ مگر عرصہ اس میں بھی سر کھپانے کے بعد کوئی کامیابی نہ ہوئی تو بعض اصحاب کے مشورے کی بنا پر ۱۹۵۶ء میں سیدھے ندوۃ العلماء لکھنوء کی راہ لی۔ اور وہاں پر چند سال رہ کر ایک طرف عربی میں مہارت حاصل کی تو دوسری طرف تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کی تحصیل پورے شوق اور انہماک کے ساتھ ہی نہیں بلکہ والہانہ انداز میں کی۔ اور اس عرصے میں راقم کو دنیا و مافیہا سے کوئی سروکار نہ رہا، بلکہ سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ قرآن اور اسلام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اس اعتبار سے ناچیز نے علوم اسلامیہ کی تحصیل ہی نہیں کی بلکہ اسلام اور اسلامی شریعت کے فلسفے کو مجموعی اعتبار سے سمجھنے اور اس کے بنیادی اغراض و مقاصد کا پتہ لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بالفاظ دیگر بندے نے ''تفقہ فی

الدین'' کے نقطۂ نظر سے اسلامی علوم کی تعلیم پورے شعور اور لگن کے ساتھ کر کے ان میں کافی بصیرت پیدا کر لی۔

سائنسی علوم کی تحصیل

ندوہ سے میری فراغت ۱۹۶۲ء میں عمل میں آئی۔ اور خوش قسمتی سے اُس وقت ندوہ کے نصاب تعلیم میں انگریزی کے علاوہ سائنس کے مبادیات کی تعلیم بھی شامل تھی۔ چنانچہ بعد فراغت راقم کو انگریزی اور سائنس کی مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق جنون کی حد تک سر پر سوار ہو گیا۔ مگر اس عمر میں کسی کالج میں داخلہ ممکن نہیں تھا، لہذا ذاتی مطالعے کے ذریعہ ایک طرف انگریزی کی استعداد بڑہانی شروع کر دی تو دوسری طرف سائنسی علوم کی مختلف کتابیں ڈھونڈ ھ ڈھونڈ ھ کر خریدنی شروع کر دیں اور ان کا مطالعہ انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ کرتا رہا۔ چونکہ طلب صادق تھی اور ان کو سمجھنے کا بھوت پوری طرح سوار تھا اس لئے چند سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد بندہ نے طبیعیات (فزکس)، کیمیا (کیمسٹری)، حیاتیات (بیالوجی) اور فلکیات (آسٹرانمی) کے بہت سے مسائل ومباحث سے واقفیت حاصل کر لی۔ ان میں سب سے زیادہ مطالعہ علم نباتات (باٹنی) کا ہے جو حیاتیات کی ایک شاخ ہے۔ پھر اس کے بعد علم کیمیا کا ہے۔ اور یہ دونوں علوم نسبتاً آسان ہیں، جب کہ طبیعیات سب سے مشکل علم ہے۔

میرے شوق مطالعے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ آج فرقانیہ اکیڈمی کی لائبریری میں مختلف سائنسی علوم ومسائل پر انگریزی اور اردو میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں اور ان میں سائنسی علوم کے بعض انسائیکلو پیڈیا بھی موجود ہیں، جو کسی بھی موضوع پر منٹوں میں پورا مواد فراہم کر دیتے ہیں۔ اور سائنسی علوم پر اردو میں موجود کتابوں کا بھی ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، جسے میں نے خود پاکستان کا سفر کر کے اکھٹا کیا ہے۔ مگر اتنا کچھ حاصل کرنے کے باوجود راقم

کو کوئی خوش فہمی بالکل نہیں ہے کہ میں نے اس کوچے کو پوری طرح سر کر لیا ہے۔ کیونکہ علم تو ایک ایسا وسیع سمندر ہے جس کے کناروں کا کوئی پتہ ہی نہیں ہے۔ لہذا میں نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ بہت کم ہے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ میں نے سائنس کا مطالعہ کم اور ''فلسفہء سائنس'' کا مطالعہ زیادہ کیا ہے۔ یعنی سائنسی علوم پر ''کلامی'' نقطۂ نظر سے غور و خوض کر کے سائنسی علوم کی اصل حقیقت معلوم کرنے میں ''اجتہادی'' کی حد تک جدوجہد کی ہے کہ ان علوم کی دینی و شرعی نقطۂ نظر سے ''قدر و قیمت'' کیا ہے اور ان سے کس حیثیت سے استدلال کیا جا سکتا ہے؟ اس لحاظ سے بندہ بطور تحدیث نعمت عرض کرتا ہے کہ مجھے اس راہ میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور میں نے ان دونوں میں تطبیق دینے کے سلسلے میں بہت سے اُصول و کلیات دریافت کر لئے، جو اس کوچے سے ناشناس لوگوں کی بخوبی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اس طرح بندہ نے مسلسل غور و خوض اور لگاتار جدوجہد کے بعد قرآن عظیم کے اُس ''بند باب'' تک رسائی ہی نہیں حاصل کر لی جو (عصر جدید کے علوم و مسائل کے تعلق سے) مقفّل تھا، بلکہ اس مقفل باب کو کھولنے کی چابی بھی دریافت کر لی ہے۔ اور اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ اسے کھول کر اُس کے اندرونی مناظر دوسروں کو بھی دکھا سکوں۔ فالحمد لله علی ذلک.

عصر جدید کا فتویٰ

لہذا اب یہ فقیر بے نوا ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید'' کے بمصداق پورے شرح صدر اور پوری جرات و بیباکی کے ساتھ یہ فتویٰ دیتا ہے کہ سائنسی علوم کے وہ ''حقائق و معارف'' جو تجرباتی و مشاہداتی طور پر ثابت شدہ، یعنی جو سائنسی دنیا میں ''مسلّمہ'' ضوابط قدرت کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ یقیناً دینی و شرعی یا قرآنی نقطۂ نظر سے قابلِ حجت اور قابل استدلال ہیں۔ اور ان کو ردّ کرنے کی کوئی بھی شرعی یا عقلی و علمی دلیل موجود نہیں ہے۔ کیونکہ آج انہی ضوابط قدرت یا قوانین

رُبوبیت کی بدولت نہ صرف قرآن کا علمی اعجاز ثابت ہوتا ہے بلکہ وہ دلائل رُبوبیت بھی کھل کر سامنے آجاتے ہیں جو نظام کائنات میں پوشیدہ تھے۔ اس حقیقت سے انکار کرنا قرآن کی کوئی خدمت نہیں بلکہ درحقیقت قرآنی حقائق کو جھٹلانے اور انہیں ''چھپانے'' کے برابر ہے۔ اب جہاں تک مادہ پرستانہ نظریات کا تعلق ہے تو اُن کی حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرست سائنس کے اصل حقائق پر مادیت کا ''لیبل'' چپکا دیتے ہیں۔ جب کہ ان حقائق کا ''اندرون'' مادہ پرستانہ توجیہات کا اباء کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اصل سائنسی حقائق و معارف میں مادہ پرستی کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ لیکن اگر ہم سائنسی علوم و مسائل پر عبور حاصل کرلیں تو پھر مادہ پرستوں کے منصوبوں پر پانی پھیرتے ہوئے سائنسی حقائق پر سے مادیت کا لیبل ہٹا کر ان پر خدا پرستی کا لیبل بڑی آسانی کے ساتھ چپکا سکتے ہیں۔ اس طرح تمام سائنسی علوم کو ''مشرف باسلام'' کیا جاسکتا ہے۔ اور اب ہم کو یہی کرنا ہے۔

غرض ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد تقریبا سات آٹھ سال تک اس راہ میں سر کھپاتے رہے۔ اور اس دوران قرآن کو ''سائنسی نقطۂ نظر'' سے اور سائنس کو ''قرآنی نقطۂ نظر'' سے خوب جانچا پرکھا اور پورے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ ان دونوں کے اسرار و حقائق تک رسائی حاصل کی۔ اس دوران مجھے معاشی، عائلی اور دیگر کئی قسم کے مسائل و مشکلات نے گھیرے رکھا۔ اور یہ مسائل بار بار میری یکسوئی میں خلل انداز ہوتے رہے، مگر میرے پیر کبھی ڈھمگا نہ سکے۔ مطالعہ اور غور و خوض کے ساتھ ساتھ کچھ تجارت بھی کرکے اپنے علاقے سے تین میل ''داسرہلی'' نامی ایک مقام پر ایک گھر بنایا اور اسے کرائے پر اُٹھا کر ۱۹۶۸ء میں پوری طرح اس کام کے لئے فارغ ہوگئے۔ ہمارے علاقے میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جسے مقامی لوگ ''ڈونگری'' کہتے ہیں۔ چنانچہ اکثر و بیشتر اور خاص کر سردیوں کے موسم میں ناشتہ کرکے کچھ کتابیں ساتھ لے کر

ڈونگری پر پہنچ جاتے اور دو پہر کو گھر واپس آتے۔ اس طرح بفضل الٰہی بندہ از رُوئے ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ بہت سے رازہائے سربستہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ.﴾ اب مجھے فکر ہونے لگی کہ میں اپنے نتائج فکر یہ سے اُمت کو بھی آگاہ کر دوں، تا کہ ان دونوں دھاروں کے بارے میں جو عمومی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ دور ہوں اور علمی دنیا کا جمود ٹوٹ سکے۔

قرآن ایک بحرِ زخار

مگر اس موقع پر بندہ یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دینا چاہتا ہے کہ اس فقیرِ پُر تقصیر کو اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے کہ میں نے اس سلسلے کے ہفت خواں پوری طرح سر کر لئے ہیں، حاشا و کلاّ۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن عظیم ایک ایسا بحرِ زخار ہے کہ اس کی گہرائیوں کو کوئی ناپ نہیں سکتا اور اس کے تمام رُموز و اسرار کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خود ایک حدیث کے مطابق ''اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہو سکتے''۔ اسی طرح سائنسی علوم و معارف بھی ایک اتھاہ سمندر کی طرح ہیں، جو ''افعالِ الٰہی'' کا مجموعہ ہونے کی بنا پر لامحدود ہیں۔ لہٰذا کوئی ایک انسان تو کیا انسانوں کی ایک پوری جماعت بھی مل کر اگر افعالِ الٰہی (جو مظاہر کائنات کے رُوپ میں ہمارے سامنے موجود ہیں) کی مکمل تشریح کبھی نہیں کر سکتی۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے:

﴿قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا.﴾ (کهف: ۱۰۹)

ترجمہ: کہہ دو کہ پورا سمندر بھی اگر میرے رب کی باتوں (اُس کی کارسازیوں کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) روشنائی بن جائے تب بھی میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی وہ سمندر ختم ہو جائے گا۔ اگرچہ ہم اُس کی مدد کے لئے اُس جیسا ایک اور سمندر لے آئیں۔

قرآن کی دعوت نئے اسلوب میں ضروری

لہذا اس بندۂ حقیر پُر تقصیر کے بارے میں کسی کو کوئی غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ وہ اس میدان کو پوری طرح سر کر چکا ہے۔ ہاں البتہ مجھے اتنا دعویٰ ضرور ہے کہ میں نے اس ''بحر حکمت'' میں غوطہ خوری کر کے بطور نمونہ چند ایسے آبدار موتی برآمد کر لئے ہیں جو نگاہوں کو خیرہ کر سکتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بندہ نے بہت سے نئے نئے ''فکری مسائل'' میں قرآن اور حدیث سے رُجوع کر کے ان کا حل بھی ''ابدی معارف'' کی روشنی میں نکالا ہے۔ اور اس کی شہادت میرے مضامین اور میری کتابیں دے سکتی ہیں۔ شاید یہ پورے عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا اولین تحقیقی کام ہے۔ کیونکہ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے کہ کسی دوسرے عالم نے اس قسم کا کام کیا ہو۔ ہاں البتہ آج کل عرب ممالک میں ایک نئے موضوع ''قرآن کا علمی اعجاز'' پر بے شمار کتابیں منظر عام پر آ گئی ہیں۔ مگر وہ قرآن کے ''مفرد حقائق'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی اُن کی نوعیت محض ''اخباری'' قسم کی ہے کہ قرآن میں فلاں فلاں ''سائنسی حقائق'' موجود ہیں۔ جب کہ فلسفیانہ یا کلامی نقطۂ نظر سے اُن پر کوئی تفصیلی بحث نہیں کی جاتی کہ ان حقائق سے کیا ثابت کرنا مقصود ہے؟ اور علمی و استدلالی نقطۂ نظر سے ان معارف سے کون سے دلائل رُبوبیت ثابت ہوتے ہیں؟ اور اس سلسلے میں ایک اور کوتاہی یہ ہے کہ ان قرآنی حقائق و معارف کو دعوتی اُسلوب میں پیش کرتے ہوئے غیر مسلموں اور منکرین خدا کی ذہن سازی اور ان کی اصلاح کا کوئی کام اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ لہذا یہ ملت اسلامیہ کے ذمہ ایک قرض ہے جو ابھی ادا نہیں ہوا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن عظیم میں نئے نئے علوم اور نئے نئے علمی حقائق و معارف کا جو تذکرہ موجود ہے وہ پوری نوع انسانی کو متوجہ اور خبردار کرنے کی غرض سے ہے کہ صحیفۂ الٰہی کوئی فرسودہ کتاب نہیں بلکہ وہ رب العالمین کی جانب سے نازل شدہ ہے جو اس کائنات کی ایک ایک

چیز اور اُس کے ایک ایک بھید سے بخوبی واقف ہے۔ اس لحاظ سے اس میں جو علمی حقائق مذکور ہیں وہ دراصل موجودہ الحادی ذہنیت کے توڑ کی غرض سے ہیں کہ مسلمان ان حقائق سے آگاہ ہو کر علمی جہاد کے میدان میں ان کو بطور "ہتھیار" استعمال کریں۔ کیونکہ "لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے" کے مطابق ہر دور کی ذہنیت کا مقابلہ اُسی کے ہتھیار سے ہونا چاہئے۔ اس لحاظ سے قرآن کی دعوت عصری ذہنیت کے پیش نظر جب تک نئے اُسلوب میں اور نئے ہتھیاروں کے ذریعہ نہ کی جائے وہ موجودہ "عقلیت پسندوں" اور "سائنس زدہ" لوگوں کے لئے بالکل بے اثر رہے گی۔ ہر دور کا ایک عقلی مزاج ہوتا ہے جسے نظر انداز کر دینے کے بعد کوئی بھی دعوت یا کوئی بھی تحریک اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔

ایک وضاحت

مگر اس موقع پر یہ غلط فہمی کسی بھی طرح نہ ہونی چاہئے کہ قرآنی الفاظ کا مفہوم ہر دور میں بدلتا رہے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآنی الفاظ میں بڑی لچک ہوتی ہے اور وہ کئی مفہوم کے حامل ہوتے ہیں، جس کی بنا پر کوئی نیا مفہوم مراد لینے سے اُس کا سابقہ مفہوم پوری طرح باطل نہیں ہو جاتا۔ اسی بنا پر خود بعض حدیثوں میں قرآن کو "ذووُجوہ" قرار دیا گیا ہے۔ یعنی بہت سے "چہروں" والا۔ (دیکھئے الاتقان، از علامہ سیوطی)

اسی طرح بعض قرآنی حقائق مجاز و کنایہ اور تشبیہات و استعارات کے رُوپ میں بھی مذکور ہیں، جن کا صحیح مفہوم تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں واضح ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں راقم کی مختلف کتابوں میں ملیں گی۔ اس لحاظ سے ہمارا رشتہ سلف سابقین سے بھی قائم رہتا ہے۔

نیز اس کے علاوہ راقم سطور کا ایک طریقہ کار یہ بھی ہے کہ میں اس سلسلے میں کوئی "نئی بات" کہنے سے پہلے معتبر اور مستند تفسیروں پر بھی ایک نظر ڈال لیتا ہوں کہ سابقہ مفسرین نے اس

سلسلے میں کیا کہا ہے۔ اگر ان کے اقوال میں کوئی تائیدی چیز یا نکتہ مل جاتا ہے تو اسے بطور ''سند'' اُبھار کر پیش کرتا ہوں، ورنہ اپنے نئے مفہوم کی تائید میں خود قرآن ہی سے دلائل پیش کرتا ہوں۔ یا پھر صحیح اُصولوں کے تحت اپنے اختیار کردہ مفہوم کی توجیہہ کرتا ہوں۔ ہر دور میں قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ یہی ہوسکتا ہے۔ اور اس طرح کی تفسیر ''تفسیر بالرائے'' نہیں ہوسکتی، جس کی بعض حدیثوں میں مذمت کی گئی ہے۔ بلکہ خود ایک حدیث کے مطابق قرآن کی صحیح تفسیر کے لئے ''علم'' کی شرط لگائی گئی ہے کہ جو شخص بغیر علم کے قرآن کی تفسیر کرے اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے (ترمذی)۔ غرض قرآن کی تفسیر صحیح اُصولوں کے تحت ہونی چاہئے، ورنہ قرآن میں مزید غور و فکر کرنے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہ جاتا۔ اور خود حدیث شریف کی تصریح کے مطابق اُس کے اسرار و عجائب کبھی منظرِ عام پر نہیں آسکتے۔ چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوسکتے (ترمذی)۔ ظاہر ہے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ لوگ قرآن میں غور کرتے رہیں اور نئے نئے اسرار دریافت کرتے رہیں۔

راقم کے کام کی اصل نوعیت

غرض بندہ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ کلامی اور دعوتی نقطۂ نظر سے ہے۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے ان قرآنی حقائق کی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ''قدر و قیمت'' واضح کرتے ہوئے طبیعیات کا تعلق مابعد الطبیعیات سے دکھانے کی کوشش کی ہے، جس کے نتیجے میں اسلام کے بنیادی عقائد کا اثبات سائنسی نقطۂ نظر سے کھل کر سامنے آجاتا ہے اور یہ پوری کائنات ایک ''منصوبہ بند'' عمل قرار پاتی ہے۔ اور پھر ان نتائج کو دعوتی انداز میں پیش کرتے ہوئے عالم انسانی کے غلط عقائد و افکار کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح عصر جدید پر باریٔ تعالیٰ کی حجت پوری ہوجاتی ہے کہ اب جسے مرنا ہو وہ دلیل دیکھ کر مرجائے۔ یہ ہے وہ مقصد المقاصد جس

کی بنا پر قرآن عظیم کو ہر قسم کے ''علمی ہتھیاروں'' سے پوری طرح مزیّن اور آراستہ کر دیا گیا ہے۔ مگر میرے محدود علم کے مطابق پورے عالم اسلام میں یہ اپنی نوعیت کا اولین اور منفرد تحقیقی کام ہے جس کی بارگاہ الٰہی سے مجھے توفیق ملی۔

اس بندۂ عاجز نے کتاب اللہ اور اُس کے معارف کی تفسیر اپنی بساط کے مطابق پورے فلسفیانہ نکات کے ساتھ کرتے ہوئے ''القرآن یفسّر بعضہ بعضاً'' (یعنی قرآن کا ایک حصہ اُس کے دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے) کے صحیح اُصول پر پورے قرآن اور اس کی مختلف آیات کے درمیان تطبیق دینے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پورا قرآن ایک ''نظام وحدت'' میں بندھا ہوا ہے، جس طرح کہ یہ پوری کائنات رُبوبیت کی ایک ''واحد یونٹ'' کے رُوپ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ بہرحال بندہ نے عصر جدید کے تعلق سے قرآن عظیم کے سربمہر خزانے کی ''سیل'' توڑ دی ہے اور اب ہر ایک کے لئے اذن عام ہے کہ وہ اس خزانے سے اپنا دامن جس قدر چاہے بھر لے۔

وہ علم جو عروج ملّت کا باعث ہے

جیسا کہ عرض کیا گیا قرآن عظیم ایک بحر زخار ہے جس کی گہرائیوں کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ اس میں جس قدر غور وخوض کیا جائے اُسی قدر اُس کے اسرار وعجائب منکشف ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ خدائے علیم وخبیر کا کلام ہے، جو اس جہانِ رنگ وبُو کی ایک ایک حقیقت سے بخوبی واقف ہے۔ اس لحاظ سے اس عالم مظاہر کے اسرار وعجائب جب بھی ''سائنسی طریقے'' سے غور وفکر کے نتیجے میں کھلتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک ''خدائے علاّم'' کا وجود خالص سائنسی طریقے سے ثابت ہو جاتا ہے۔ جو عصر جدید کے مادہ پرستوں کے خلاف خدا کی موجودگی کا ایک ''سائنٹفک ثبوت'' ہے، جو مادیت کی بنیادیں ہلا سکتا ہے۔ بشرطیکہ آج کے مسلمان قرآن عظیم کی

اس نوعیت کا مطالعہ کر کے عصر جدید کے تقاضوں کے مطابق کام کریں، تا کہ اس کے نتیجے میں موجودہ گمراہ انسانوں کو ہدایت نصیب ہو سکے۔ اس مقصد کے لئے قرآن عظیم میں ''دلائل رُبوبیت'' کا ایک پورا نظام موجود ہے، جو مظاہر کائنات میں موجود خدائی اسباق و بصائر کے رُوپ میں آج پوری طرح جلوہ گر نظر آ رہا ہے۔ انہی خدائی اسباق و بصائر کو قرآن کی زبان میں ''آیات'' یعنی ''خدائی نشانیاں'' قرار دیا گیا ہے۔ اور ان نشانیوں (دلائل رُبوبیت) کو پوری طرح منظر عام پر لانا کسی ایک دو افراد کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کام کو علی وجہ البصیرت انجام دینے کے لئے بہت سے علوم و مسائل سے واقفیت ضروری ہے، جن پر کوئی اکّا دکّا فرد حاوی نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے یہ کام ایک ''ٹیم ورک'' کا طالب ہے۔ اور اس کام کو انجام دینے کے لئے اہل نظر علماء اور مسلم ماہرین سائنس کی ایک جماعت درکار ہے، ورنہ عصر جدید میں عالم انسانی پر اللہ کی حجت پوری نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ راقم نے اپنی تصنیفات میں جا بجا اس کام کی اہمیت پر ارباب ملت کی توجہ مبذول کی ہے، مگر اب تک کسی کے کان پر جوں نہیں رینگ سکی ہے۔ بلکہ درحقیقت کسی نے اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور ہی نہیں کیا ہے، جو اُمت اسلامیہ کی ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے۔

یہ کام اجتماعی نوعیت کا ہے، اور جب تک اسے اجتماعی طور پر انجام نہ دیا جائے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مثل مشہور ہے کہ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ غرض عصر حاضر میں ملّت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ اس علم (قرآنی دلائل و براہین) کے ظہور و عروج کی محتاج ہے۔ اب دیکھئے یہ ملّت اپنے اس شرعی فریضے کو ادا کرنے کے قابل کب بنتی ہے؟

میری قلمی زندگی پر ایک نظر

بہر حال بندہ ۱۹۶۹ء تک ''قرآن اور کائنات'' یا ''قول الٰہی اور فعل الٰہی'' کی حقیقت

اور ان دونوں کے درمیان ربط و تعلق کی کڑیاں دریافت کرنے اور الجھی ہوئی ڈور کا سرا تلاش کرنے کی راہ میں دن رات غلطاں و پیچاں رہا۔ اسی دوران جولائی ۱۹۶۹ء میں دو امریکی خلا بازوں کے ذریعہ چاند کی سرزمین پر پہنچنے کا واقعہ پیش آیا تو دینی حلقوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اور بعض اہل علم نے اس واقعہ کو غلط اور سراسر جھوٹ قرار دے کر اس کا سرے سے انکار کر دیا۔ تو بندہ کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکل کر قلمی میدان میں کودنا پڑا۔ چنانچہ قرآن حکیم کے ابدی حقائق کی روشنی میں اس واقعے کا جائزہ تفصیل کے ساتھ لیتے ہوئے اس مسئلے کے متعدد علمی پہلوؤں پر مضامین لکھنے شروع کر دئے، جو ہفت روزہ ''صدقِ جدید'' لکھنؤ اور ماہنامہ ''بُرہان'' دہلی میں مسلسل چھپنے شروع ہو گئے۔ اور پھر ان مضامین کا ایک مجموعہ ''چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں'' کے نام سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا، جس کا مقدمہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تحریر کرتے ہوئے اسے ایک ''ایمان افروز'' کتاب قرار دیا تھا۔ یہ کتاب میں نے اپنی ایک زمین بیچ کر شائع کی تھی۔ اور ان مضامین کا دوسرا مجموعہ جو خاص کر ''صدق جدید'' میں شائع ہوئے تھے ''اسلام اور عصر حاضر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اور اس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے تحریر کرتے ہوئے راقم کو مستقبل میں ''اسلامیات کا شہاب ثاقب'' ہونے کی پیش گوئی کر دی تھی۔

بہر حال پہلی کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی فرقانیہ اکیڈمی کی تاسیس عمل میں آئی اور یہ کتاب علمی حلقوں میں خوب مقبول ہوئی، جس کے باعث راقم کو زبردست خراج تحسین حاصل ہوا۔ اس سے حوصلہ بلند ہوا تو میں نے قرآن کے مختلف موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھنا شروع کر دیں، جو ہندو پاک کے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپنے لگے۔ پھر میں نے ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: قرآن کی نظر میں'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب لکھی، جو مجلس نشریات اسلام کراچی سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اور اس کی اشاعت کے لئے بندہ کو پاکستان جانا پڑا۔ اس کتاب کے

مقدمہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اسے ''فکری لغزشوں سے پاک'' قرار دیا ہے۔

اس کے بعد میری کتابیں دھڑا دھڑ چھپنے لگیں اور ان کے مختلف ایڈیشن پاکستان سے نکلنے لگے۔ ایک ایک کتاب کو کئی کئی ناشرین نے بلا اجازت بیک وقت شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح میری کتابیں ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں خوب مقبول ہوئیں۔ پاکستان میں میرے تحقیقی مضامین ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک سے ۳۰-۳۲ سال سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں، جو دارالعلوم حقانیہ کا ترجمان ہے۔ چنانچہ مولانا سمیع الحق حقانی صاحب میرے مضامین کے بہت بڑے شائق اور قدردان ہیں۔ اور ہندستان میں تقریباً پانچ سال سے ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں میرے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ چل رہا ہے، جس کے مُدیر مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ہیں۔

میری آواز عالم اسلام میں

ناچیز کو اردو کے علاوہ جدید عربی زبان میں لکھنے کی بھی استعداد حاصل ہے۔ چنانچہ میری پہلی عربی کتاب ''**بین علم آدم والعلم الحدیث**'' رابطہء عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی، جو قرآنی نقطۂ نظر سے خلافت ارض کے لئے سائنسی علوم کی اہمیت جتانے والی تھی۔ پھر اُس کے بعد میرے عربی مضامین عرب ممالک کے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہونے لگے۔ اور خاص کر جامع ازہر قاہرہ کے ماہنامہ ''الازہر' اور رابطہ کے عربی اخبار ''العالم الاسلامی'' میں بہت سے تحقیقی مضامین شائع ہوئے نیز رابطہ کے انگریزی جرنل ''مسلم ورلڈ لیگ جرنل'' میں میری مضامین کے انگریزی تراجم مسلسل چھپ رہے ہیں۔ اس سے حوصلہ پا کر میں نے قرآنی حقائق ومعارف اور اپنی فکر کو عالم عرب میں روشناس کرانے کی غرض سے عربی میں کئی کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور میری متعدد کتابوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ کروایا۔ اور ان سب کو

فرقانیہ اکیڈمی کے تحت بڑے اہتمام کے ساتھ چھپوایا اور انہیں عالم اسلام کی اہم شخصیتوں کو بھجوایا۔

پھر ۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء میں مصری حکومت کی جانب سے منعقدہ دو بین الاقوامی کانفرنسوں اور ''وامی'' (ورلڈ اسمبلی آف مسلم یُوتھ) ریاض کی جانب سے منعقدہ عمان کی بین الاقوامی کانفرنس میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ چنانچہ ان کانفرنسوں میں راقم نے بالترتیب حسب ذیل تین مقالے عربی زبان میں پیش کئے: (۱) التقدم في العلم والتكنولوجيا ضرورة أكيدة من منظور إسلامي (۲) أهمية الجهاد لنهضة العالم الإسلامي (۳)إنحطاط المسلمين في العلم والتكنولوجية ومؤثراته الناكسة على الشباب المسلم. چنانچہ یہ تینوں مقالے مذکورۂ بالا کانفرنسوں کی رپورٹوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز اس کے علاوہ یہ مقالے کتابچوں کی شکل میں فرقانیہ اکیڈمی کے تحت بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان میں سے تیسرے مقالے کا ترجمہ اردو اور انگریزی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ چنانچہ اردو میں اس کا نام ''سائنسی میدان میں مسلمانوں کا عروج وزوال اور اُس کے اسباب ومحرکات'' ہے۔

بہرحال ان کانفرنسوں میں شرکت کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ میں نے خاص کر اپنی عربی تصنیفات سیکڑوں کی تعداد میں ہر جگہ تقسیم کیں۔

پھر اس کے بعد میں نے عرب ممالک کے سربراہوں کو اپنی تصنیفات خصوصی طور پر بھجوائیں۔ اس طرح راقم کی دعوت اور اُس کی آواز سارے عالم اسلام میں پہنچ چکی ہے۔ اور بندے نے اس سلسلے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فالحمد لله على ذلك.

عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ

عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے ایک علمی تحریک چلانے کا جذبہ اُس وقت بیدار ہوا جب میں نے سورۂ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کا انوکھا قصہ پڑھ کر اس کے اسباق وبصائر پر

غور کرنا شروع کیا، جس میں خلافت ارض اور علم الاسماء (علم الاشیاء) کے تعلق پر اس اُمت کی بیداری کے لئے ایک حیرت انگیز اُسلوب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ بندہ نے ان اسباق وبصائر کو قلمبند کرنا شروع کردیا تو اس کے نتیجے میں پونے چھ سو صفحات کی ایک کتاب وجود میں آ گئی جو پاکستان سے شائع ہوئی۔ یعنی ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: قرآن کی نظر میں''۔ اسی کتاب کے مباحث کا خلاصہ اور اضافہ عربی زبان میں ''**بین علم آدم والعلم الحدیث**'' کی شکل میں وجود میں آیا۔ اور اس کی اشاعت رابطہء عالم اسلامی کے تحت ہوئی۔ ان دونوں کتابوں کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

یہ میری سب سے اہم اور بنیادی فکر ہے، جو میری تمام تصنیفات میں مختلف اسالیب اور پیرایوں میں کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً مذکور ہے۔ اور میں ہمیشہ اسی فکر میں غلطاں اور پیچاں رہا ہوں کہ قوم وملّت کو اس بنیادی حقیقت سے آ گاہ کر کے اُسے خلافت ارض کا میدان طے کرنے کے لئے پھر سے آمادۂ عمل کیا جائے۔ چنانچہ اس حقیقت سے واقف کرانے کے لئے زیادہ تر اردو میں لکھا اور کبھی کبھی عربی میں بھی کوئی مضمون لکھ کر عربی اخبارات کو بھیج دیا کرتا تھا۔ اس طرح عالم عرب میں جب میری شہرت بڑھی تو مجھے ۱۹۹۶ء میں الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی (وامی) کی جانب سے ایک کانفرنس کے لئے مقالہ لکھنے کی دعوت دی گئی، اور اس کے لئے جو عنوانات تجویز کئے گئے تھے ان میں سے ایک عنوان میرے لئے موزوں تر دکھائی دیا وہ یہ تھا: ''سائنسی میدان میں مسلمانوں کا زوال اور اُس کے اثرات مسلم نوجوانوں پر''۔ مقالہ تو میں نے لکھ کر بھیج دیا، مگر اس موضوع پر مزید غور کیا تو نظر آیا کہ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ لہذا میں نے مذکوۂ بالا مقالے کو اپنی کتاب کا پہلا باب قرار دے کر مزید تین ابواب لکھ ڈالے، جن میں خاص کر عالم اسلام کے خصوصی مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''خلافت

ارض'' کا فلسفہ ایک نئے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب کا نام میں نے ''(عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ: قرآن کریم کے سائے میں'') تجویز کیا۔(نهضة العالم الإسلامي في ضلال القرآن الكريم) یہ کتاب چھپنے سے پہلے ہی مصری حکومت کی جانب سے منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت نامہ ملا، جسے جولائی ۱۹۹۸ء میں منعقد ہونا تھا۔تو راقم نے جھٹ سے اس پوری کتاب کا خلاصہ ایک مقالے کی شکل میں تیار کر کے بھیج دیا، جس کا عنوان تھا ''اسلامی نقطۂ نظر سے سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی انتہائی ضروری ہے'' (التقدم في العلم والتكنالوجيا ضرورة أكيدة من منظور إسلامي)۔اللہ کے فضل وکرم سے میرے یہ دونوں مقالے نہ صرف پسند کئے گئے بلکہ انہیں کانفرنس کے مجموعۂ مقالات میں اول نمبر پر شائع کیا گیا۔ وامی کی کانفرنس اُردن کی راجدھانی عمان میں اکتوبر ۱۹۹۸ء میں منعقد ہوئی۔قاہرہ کانفرنس کا موضوع ''اسلام اور اکیسویں صدی'' (الإسلام والقرن الحادي والعشرون) تھا اور اس کا بنیادی محور ''گلوبلزم'' تھا۔

مذکورۂ بالا کتاب کا آخری باب جس کا عنوان تھا ''علم کیمیا وطبیعیات اور پٹرول اور پٹروکیمیکلس کی اہمیت'' (أهمية علم الكيمياء والفيزياء وخطورة النفط والبتروكيمائيات)۔اس باب کو ایک مستقل کتاب کی شکل میں شائع کر کے اسے مذکورۂ دونوں کانفرنسوں میں کثیر تعداد میں تقسیم کیا گیا۔قاہرہ کے قیام کے دوران قاہرہ یونیورسٹی کے شعبۂ سائنس کے صدر ڈاکٹر احمد فؤاد باشا سے ملاقات ہوئی اور ان کو میں نے اپنی مذکورۂ بالا کتاب (عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ) کا مسودہ دکھایا تو وہ اس عنوان سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کا مقدمہ لکھنا منظور کر لیا۔پھر یہ کتاب موصوف کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۹۹ء میں فرقانیہ اکیڈمی کے تحت بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوئی،جس میں موصوف نے اسے اپنے

موضوع پر نہایت درجہ اہم اور ضروری کتاب قرار دیتے ہوئے دل کھول کر اس کی داد دی۔ چنانچہ اسی سال مصری حکومت نے اس ناچیز کو اس سال منعقد شدہ کانفرنس میں شرکت کی دوبارہ دعوت دی تو میں اس کتاب کے ایک سو نسخے اپنے ساتھ لے جا کر دنیا بھر سے شریک ہونے والے اہم مندوبین کو بطور ہدیہ پیش کیے۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۸ء والا قاہرہ کانفرنس کا مقالہ بھی چھپوا کر اس کے نسخے کثیر تعداد میں تقسیم کیے۔

اس دوران مجھے خواہش ہوئی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے عربی مدارس کا دورہ کر کے اپنے افکار و خیالات کو لیکچروں کی شکل میں پیش کروں، تاکہ ہماری ملّت میں ایک عام بیداری پیدا ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے خود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دعوت پر میں نے سب سے پہلے ندوۃ العلماء جانا طے کیا۔ لہذا مارچ ۱۹۹۸ء میں راقم نے ندوۃ العلماء میں تین لیکچر دیے، ایک اردو میں اور دو عربی میں، جو تحریری شکل میں تھے۔ اس موقع پر طلبہ نے کافی جوش و خروش دکھایا اور غور سے میری باتوں کو سنا۔ یہ تینوں لیکچر میری مذکورہ نئی کتاب (عالم اسلام کی نشأۃ ثانیہ) سے ماخوذ تھے۔ مگر میرے کثرت مشاغل اور بعض ناگفتہ بہ اسباب کی بنا پر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

سفرنامۂ مصر

غرض قاہرہ سے واپسی کے بعد میں نے قاہرہ کانفرنس کی رُوداد مفصل طور پر تحریر کر کے اخبارات میں شائع کرائی اور اس کانفرنس کی علمی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اسلام اور جدید مسائل کی نوعیت کا تعارف کرایا اور علماء کو جدید چیلنجوں سے نپٹنے کی دعوت دی۔ نیز اس کے علاوہ ''سفرنامۂ مصر'' کے عنوان سے ایک کتاب بھی تصنیف کر ڈالی، جو ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ''قدیم مصر اور فرعونی آثار'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ بھی لکھا جو ماہنامہ ''معارف''

اعظم گڑھ سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مقالہ سفر نامہء مصر کے ساتھ انشاءاللہ عنقریب شائع ہوگا۔

اسلام اور جدید عالمی نظام

قاہرہ کی ۱۹۹۸ء والی کانفرنس چونکہ گلوبلزم (ایک نئی قسم کی جہانگیری) کے موضوع پر تھی جو امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر (جدید عالمی نظام) سے جڑی ہوئی ہے، اور یہ ایک بالکل نیا موضوع ہے، جس سے اردو دنیا تقریباً ناواقف ہے۔ لہذا ضروری معلوم ہوا کہ اس نئے خطرے اور نئے فتنے سے اُردو دنیا کو واقف کرایا جائے۔ لہذا اس موضوع اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا تعارف کراتے ہوئے اکیسویں صدی میں اسلام کو درپیش ''عالمی خطرات'' اور اس سے نپٹنے کی تدابیر واضح کرنے کی غرض سے ایک کتاب ''اسلام اور جدید عالمی نظام'' کے عنوان سے لکھی جو ۲۰۰۰ء میں اکیڈمی کے تحت شائع ہوئی۔ چنانچہ اس کتاب میں جن خدشات وخطرات کا اظہار کیا گیا تھا وہ حالیہ دنوں میں سُقوط افغانستان کی شکل میں ظاہر ہوا، جو نیو ورلڈ آرڈر کا اولین نشانہ تھا۔ اب پتہ نہیں اگلا نشانہ کون بنے گا؟ یہ اُمت مسلمہ کو سزا ہے اس بات کی کہ اُس نے خلافت ارض کے تقاضوں اور اُس کی تیاری کو پوری طرح نظر انداز کر دیا۔ اللہ رحم کرے عالم اسلام پر۔

اسلامی شریعت پر تحقیقی کام

۱۹۸۵ء میں ہندستان میں اسلامی شریعت یا مسلم پرسنل لاء پر ایک منظّم حملہ ہوا جو فرقہ پرستوں کی سازشوں کا نتیجہ تھا۔ یہ فُسطائی طاقتیں ہندستان میں مسلم پرسنل لاء کو پوری طرح ختم کر کے کامن سول کوڈ نافذ کرنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہندستانی سپریم کورٹ نے ایک غلط فیصلہ دے کر اس مُہم جُوئی کے لئے راستہ صاف کرنا چاہا، جو شاہ بانو کیس کے نام سے مشہور ہوا اور وہ ''نفقہء مُطلّقہ'' سے متعلق تھا۔ اس غلط فیصلے کی وجہ سے مسلمانانِ ہند پر ایک بجلی سی گر پڑی تو

اُنہوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ اور پھر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا کہ مسلمان سڑکوں پر اُتر آئے اور سارے ہندستان میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر جگہ جلسے، جلوس اور مظاہرے ہونے لگے۔ ان ہنگامہ آرائیوں کے نتیجہ میں حکومت نے گھبرا کر یہ فیصلہ واپس لے لیا اور ایک نئے ایکٹ ''مُطلّقہ مسلم خواتین ایکٹ ۱۹۸۶ء'' کو نافذ کیا تو مسلمانوں کی جان میں جان آئی۔ مگر وہ احتجاج اور مظاہرے کر کے اس طرح خاموش ہو گئے گویا کہ کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ حالانکہ یہ وقت علمی طور پر کام کر کے اسلامی شریعت کی معقولیت ثابت کرنے کا ایک سنہری موقع تھا۔

چونکہ راقم قومی وملّی معاملات میں بہت زیادہ حسّاس واقع ہوا ہے، اور میری اُفتادِ طبع ہے کہ جو مسائل دین وشریعت سے متعلق ہوں اور اُن پر جب کبھی آنچ آجائے تو میں اُن کی تحقیق کتاب وسنت کی روشنی میں کیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جب میں نے نفقۂ مطلقہ کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیا تو اس کے نتیجے میں حسب ذیل دو تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں: (۱) سپریم کورٹ کا فیصلہ: حقائق وواقعات کی روشنی میں (۲) شریعت اسلامیہ کی جنگ: نفقۂ مطلقہ کی روشنی میں، یہ دونوں کتابیں ۱۹۸۶ء میں فرقانیہ اکیڈمی کے تحت منظر عام پر آئیں۔ ان میں تفصیل اور پورے دلائل کے ساتھ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کر کے گمراہ کن نظریات کا رد کیا گیا ہے۔

پھر اس کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ اسلامی شریعت کے عقلی محاسن پر ایک تحقیقی کتاب لکھی جائے جس میں اسلامی شریعت کی معقولیت ثابت کر کے اس پر ''بے عقلی'' کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے اُس کا رد کیا جائے۔ چنانچہ اس موضوع پر ایک کتاب ''اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں'' تصنیف کر کے اسے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آیا۔ فرقہ پرستوں کا سب سے بڑا نشانہ چونکہ طلاق اور تعدد ازدواج ہیں ان پر بھی دو کتابیں (۱) اسلام کا قانون طلاق قرآن اور حدیث کی روشنی میں

(۲) تعدد ازدواج پر ایک نظر: یہودی، اسلامی اور ہندو قوانین کا ایک جائزہ'' کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔ پھر اُس کے بعد (۱) اسلام کا قانون نکاح (۲) نکاح کتنا آسان اور کتنا مشکل (۳) عورت اور اسلام، کے نام سے بھی تحقیقی کتابیں وجود میں آئیں۔

اسی طرح ہندستان میں جہیز کی وبا ایک ہولناک شکل اختیار کر چکی ہے اور اس کی لپیٹ میں آج مسلم معاشرہ بھی آ گیا ہے، لہٰذا اس کے رد میں دو کتابیں (۱) جہیز ایک غیر اسلامی تصور (۲) جہیز خلاف شریعت کیوں؟ کے عنوان سے تصنیف کر کے شائع کیں۔ اور ان تمام کتابوں میں قرآن اور حدیث کے مُسکت دلائل سے استدلال کرتے ہوئے بعض نئے حقائق کا استنباط قرآن اور حدیث کے ابدی نصوص سے کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد نکاح اور جہیز کے سلسلے میں بعض اصلاحی مضامین ہندستان بھر کے بڑے بڑے اردو اخبارات میں شائع کرائے گئے اور اُن کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں بھی چھاپ کر ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کئے گئے تا کہ ان کے ذریعہ عوام میں بیداری پیدا ہو۔

غرض بندہ نے صرف سائنسی وفکری مسائل وموضوعات ہی پر نہیں بلکہ شرعی مسائل وموضوعات پر بھی کام کر کے اُمت اسلامیہ کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نیز اس کے علاوہ اور بھی کئی موضوعات پر قلم اُٹھا کر علم کا حق ہر طرح سے ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ سب محض رضائے الٰہی اور اُمت کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کیا ہے۔

علم ایک وحدت

اس طرح بندہ نے ایک طرف علمی وفکری مسائل اور دوسری طرف شرعی وفقہی مسائل دونوں میں بیک وقت کام کر کے اسلام کو ایک مکمل دین اور قرآن عظیم کو ایک کامل صحیفہ قرار دے کر کام کیا اور اپنے نتائج فکر یہ اُمت کے سامنے پیش کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن عظیم کا اصل

معجزہ اُس کی ''کمالیت'' اور ''دوامیت'' ہی کی بنا پر ہے کہ وہ کسی بھی دور میں ایک کامل اور دائمی صحیفہ نظر آتا ہے۔ مگر موجودہ دور میں اہل اسلام پر کتاب الٰہی کی یہ کمالی حیثیت پوری طرح مشتبہ ہوگئی ہے اور وہ اسے محض شرعی مسائل کی کتاب قرار دے کر اس کے علمی وفکری احکام ومسائل سے لاتعلق ہوگئے ہیں، جس کی سزا وہ آج اچھی طرح بھگت رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علم ایک ایسی وحدت ہے جس کی تقسیم نہیں ہوسکتی، چاہے وہ شرعی علم ہو یا مظاہر کائنات سے متعلق علم۔ کیونکہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اس لئے وہ ''افعال الٰہی'' کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اُس کی قدرت وخلاقیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ جب کہ دوسری طرف قرآن عظیم ''اقوال الٰہی'' کا مجموعہ ہونے کی بنا پر ابدی سچائیوں پر مشتمل نظر آتا ہے۔ اسی بنا پر کتاب اللہ میں شرعی علم اور کائناتی (یا تکوینی) علم دونوں کو بطور وحدت ''علم'' قرار دیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں راقم کی متعدد تصنیفات اور خاص کر ''جدید علم کلام: قرآن اور سائنس کی روشنی میں'' میں ملیں گی۔ اس لحاظ سے قرآن علم شریعت اور علم کائنات (یا تکوینیات) دونوں سے مزیّن اور جامع صحیفہ اور ایک حسین گلدستہ ہے۔ لہٰذا ہمارے ایک ہاتھ میں شریعت اور دوسرے ہاتھ میں تکوینی علم بھی ہونا ضروری ہے، ورنہ ہم خلافت کے میدان میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اس اعتبار سے باریٔ تعالیٰ اس اُمت کے مستقبل کے لئے جو فیصلے ازل ہی میں کردئے ہیں اُن سے سرتابی کرنا ہمارے لئے کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ لہٰذا ہم محض اپنی ''صوابدید'' کی بنا پر خداوند عالم کے بعض احکام کو ضروری اور بعض احکام کو ''غیر ضروری'' قرار دے کر انہیں رد نہیں کرسکتے۔ ورنہ ہماری روش یہود ونصاریٰ کی طرح ہوجائے گی، جن کے بارے میں باریٔ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ. ﴾ (بقرہ: ۸۵)

ترجمہ: تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور اُس کے دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟

لہذا اس قسم کی تفریق ایک مؤمن و مسلم کے لئے کسی بھی طرح جائز نہیں ہے۔ بلکہ اُسے ہر حال میں احکام الٰہی کا پابند رہنا چاہیئے۔

کلامیاتِ قرآن پر تحقیقی کام

جیسا کہ میں پچھلے صفحات میں عرض کر چکا ہوں راقم نے قرآن اور کائنات یا قرآن اور سائنس کا مطالعہ ''کلامی'' یا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اور ان دونوں کا ربط و تعلق دریافت کرنے کی راہ میں اپنی عمر عزیز کا ایک بہت بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں کئی کتابیں وجود میں آئیں، جن میں کلامی نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے قرآن عظیم کے علمی اسرار وحقائق کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بنیادی حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ کتاب اللہ میں علمی حقائق کا جو بیان ہے وہ محض اس کتاب کی زینت بڑہانے کی غرض سے نہیں بلکہ ان کے ذریعہ جہاں ایک طرف توحید، رسالت اور عقیدۂ قیامت کا سائنٹفک ثبوت پیش کرنا ہے تو دوسری طرف مادہ پرستانہ اور ملحدانہ فلسفوں کا ردو ابطال بھی کرنا ہے۔ چنانچہ جدید سائنسی علوم میں رسوخ حاصل کر لینے کے بعد ہم کو یہ بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جس کی بنا پر ہم یہ شرعی فریضہ بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ مگر اہل اسلام کی اس سلسلے میں ایک بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ ان علوم سے ناواقفیت کی بنا پر انہیں بدلتے ہوئے نظریات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، جب کہ دوسری طرف وہ قرآن کو ''کتاب ہدایت'' قرار دے کر ان علوم سے اُس کا تعلق ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ لہذا راقم نے اپنی تصانیف میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش خود قرآنی دلائل کی روشنی میں کی ہے۔ اس موضوع پر ایک تازہ ترین کتاب ''قرآن عظیم کا نظام دلائل اور اُمت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ'' بھی منظر عام پر آ چکی ہے جو اس مسئلے میں کسی بھی طرح کا ''عذر'' کرنے والوں کے لئے آخری درجے کی حجت ہے۔ اور یہ کتاب میرے پورے پچاس سال کے غور وفکر

کے بعد وجود میں آئی ہے۔ لہذا اب اہل اسلام کو ان علوم و مسائل سے واقف ہو کر کتاب الٰہی کی صحیح تفسیر کرنے اور گمراہ انسانوں کو ہدایت دکھانے کی راہ میں کسی قسم کا تامل یا عذر کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ صحیفہء ربانی میں جدید علوم و مسائل کا تذکرہ دلیل و استدلال کے میدان میں اللہ کی حجت پوری کرنے کی غرض سے ہے، جو ''کتاب ہدایت'' کا ایک زبردست کمال ہے۔ لہذا اسے کسی بھی طرح حقیر سمجھا نہیں جا سکتا۔ ہم کو تو خدا کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے کتاب اللہ کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہیئے۔

بہر حال اس نقطۂ نظر سے راقم نے ''قرآنی کلامیات'' پر اپنی تحقیقات کا ایک ''انبار'' لگا دیا ہے، جو اس راہ میں کام کرنے والوں کے لئے دلیل راہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ کلامیاتی (فلسفیانہ) نقطۂ نظر سے راقم کی سب سے زیادہ ضخیم اور مدلل کتاب ''قرآن حکیم اور علم نباتات'' ہے جو پورے تیس سال کے غور و فکر کے نتیجے میں ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں راقم نے قرآن عظیم کے فلسفہء رُبوبیت پر بحث کرتے ہوئے توحید، رسالت اور قیامت پر نباتات کے حیرت انگیز مظاہر سے استدلال کیا ہے اور اس میں ''جدید علم کلام'' کا بھی ایک خاکہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب میری اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے جو ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اسی طرح ایک اور کتاب ''قرآن مجید اور دنیائے حیات'' کے نام سے بھی شائع ہو چکی ہے، جس میں عالم نباتات کے بعض پہلوؤں پر قرآن حکیم کے ''لازوال کُلّیات'' کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

یہ کتابیں چونکہ خالص علمی و تحقیقی نوعیت کی تھیں جو عام پڑھے لکھے طبقے کی دسترس سے باہر تھیں اس لئے راقم نے عوامی بیداری کے لئے ان مسائل و موضوعات پر حد درجہ آسان انداز میں مضامین لکھنے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا اور انہیں ہندستان کے تمام بڑے بڑے اخبارات میں شائع کرایا۔ اور پھر ان کا مجموعہ ''قرآن، سائنس اور مسلمان'' کے عنوان سے شائع کرایا، جس کی اشاعت ۱۹۸۸ء میں عمل میں آئی۔

تخلیق آدم اور نظریہء ارتقاء

عصر جدید کے مُلحدانہ فلسفوں میں ''نظریہء ارتقاء'' چونکہ حد درجہ گمراہ کن ہے جو تمام ''انحرافی'' نظریات کی ''ماں'' کا درجہ رکھتا ہے، لہذا اس کے خلاف بھی خالص قرآنی نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے قوی دلائل کی روشنی میں اس حقیقت پر سے پہلی بار پردہ اُٹھایا کہ اس بے بنیاد بلکہ ''غیر سائنٹفک'' نظریہ اور اسلامی نظریات میں ''تطبیق'' کی کوئی صورت نہیں ہے۔ بلکہ اس نظریہ کو فروغ دینے میں مادہ پرستوں سے زیادہ یہودیوں کا ہاتھ ہے، جنہوں نے نوع انسانی کو بد اخلاقی اور جنسی انارکی میں جھونک کر پوری دنیا پر اپنی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں بعض تاریخی حقائق بھی پیش کئے گئے ہیں۔ اور خود سائنسی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک بے بنیاد نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے، جس سے مادہ پرست محض خدا کا انکار کرنے کی غرض سے چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ''تخلیق آدم اور نظریہء ارتقاء'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے انگریزی اور عربی ایڈیشن بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں اس دوران شائع ہوئیں، جیسے: (۱) اسلام اور جدید سائنس (۲) قرآن عظیم کا نیا معجزہ اور علماء کی ذمہ داریاں (۳) رُؤیت ہلال کے لئے فلکیاتی حساب معتبر ہے یا نہیں؟ (۴) سورج کی موت اور قیامت (۵) اکیسویں صدی کا جہاد: قرآن عظیم کے ذریعہ۔ اور یہ تمام کتابیں شاندار گٹ اپ کے ذریعہ شائع کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں عربی اور انگریزی میں بھی آ چکی ہیں۔ اور ان کتابوں کے اردو ایڈیشن پاکستان میں بلا اجازت چھاپے جا رہے ہیں، سوائے مجلس نشریات اسلام کراچی کے۔ مگر مجھے افسوس کے بجائے خوشی ہو رہی ہے کہ میری کتابیں بیرونی ممالک میں زیادہ مقبول ہو رہی ہیں۔ یہاں پر تو ان کا قدردان دکھائی نہیں دیتا۔

علمی خطبات کا سلسلہ

نیز راقم نے عوامی بیداری کے لئے ۱۹۹۴ء میں فرقانیہ اکیڈمی کے زیر اہتمام بنگلور میں قرآن اور سائنس کے موضوع پر ماہانہ لیکچرس کا ایک سلسلہ شروع کیا اور آٹھ لیکچرس دئے، جو بنگلور کی تاریخ میں نہ صرف اولین سلسلہ تھا بلکہ وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بھی اہم ترین تھا۔ ان خطبات میں سب سے پہلے قرآن اور کائنات کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے نہ صرف اس سلسلے میں قرآن ہی سے دلائل پیش کئے گئے بلکہ قدیم علماء کی تحریروں سے بھی استدلال کر کے بتایا گیا کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ خود احادیث میں بھی اس بات کا ذکر موجود ہے کہ قرآن تمام علوم کا جامع ہے، جس میں اگلی اور پچھلی تمام قوموں کا حال چال مذکور ہے۔ اس میں ایک لیکچر ''اجرام سماوی اور قیامت'' کے عنوان سے بھی موجود ہے، جس کی حقیقت جدید ترین اکتشافات کی روشنی میں کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اسی طرح بعض لیکچر خدا کے وجود اور اُس کی رُبوبیت پر نباتات کی گواہی کے سلسلے میں بعض دلچسپ اور سبق آموز سائنسی حقائق کی نشاندہی کرنے والے ہیں، جو عالم انسانی کے اذعان کے لئے نہایت درجہ اہم ہیں۔ اس سلسلے میں ایک جدید ترین سائنسی تجربے ''کلوننگ'' (مصنوعی سائنسی عمل کے ذریعہ کسی حیوان کا ہم شکل یا ڈوپلکیٹ تیار کرنے) کے ذریعہ آج جو حیرتناک حقیقت سامنے آئی ہے وہ دراصل حیات ثانی کے اثبات کا ایک ''سائنسی ثبوت'' ہے۔ اس موضوع پر مفصل بحث کرتے ہوئے آخری مقالے میں قرآن اور حدیث کے بعض چونکا دینے والے حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ اور یہ قرآنی انکشاف پوری نوع انسانی کو بیدار کرنے کے لئے ایک دلیل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض یہ خطبات جو تحریری شکل میں پیش کئے تھے اُن کا مجموعہ ''قرآن اور نظام فطرت'' کے عنوان سے ۱۹۹۸ء میں منظر عام پر آ گیا ہے۔ اور اس کے عربی اور انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔

صحافت کے میدان میں

راقم کو اکیڈمی چلانے اور اس کے اغراض و مقاصد کی تشہیر کرنے کی غرض سے صحافت کا بھی سہارا لینا پڑا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ کسی نے ایک غلط مشورہ دے کر مجھے اس ''خارزار'' میں دھکیل دیا۔ اکیڈمی کے قیام کو ابھی دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ میں نے ۱۹۷۲ء میں ''تعمیر فکر'' کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا اور اسے عوام میں مقبول بنانے کی غرض سے نیم علمی اور نیم اصلاحی انداز میں نکالنا شروع کیا۔ اکثر مضامین خود بھی لکھتا تھا، پھر اس کی کتابت وطباعت کرانے اور انتظامی اُمور کو سنبھالنے کی ساری ذمہ داریاں بھی مجھی پر تھیں۔ اس کے علاوہ لوگوں سے ملنا ملانا اور اس کا چندہ اُصول کرنے کا بار بوجھ بھی میری ہی ذمہ داری تھی۔ دو ایک افراد کو ساتھ ضرور لیا مگر وہ کسی بھی طرح چل نہیں سکے۔ بلکہ ان سے بجائے نفع کے نقصان ہوا۔ اس کا ایک شمارہ نکالنے کے بعد دوسرے شمارے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ہر شمارہ کے بعد دوسرے شمارے کے لئے رقم اکھٹا کرنی پڑتی۔ اور میں نئے نئے خریدار بنا کر اپنا کام چلایا کرتا تھا۔ اس وقت رسالے کا سالانہ چندہ صرف پانچ روپئے تھا۔ مگر اتنی رقم دینے سے بھی لوگ کتراتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو دو دو چار چار چکر لگانے پڑتے تھے۔ مگر بندہ اپنی دُھن میں سوار مایوس ہوئے بغیر کام کرتا رہا۔ کیونکہ مجھے اکیڈمی کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا تھا۔ اس لئے ہر قسم کی مشقتیں اور مصائب برداشت کرتا رہا۔ اور اس میں لوگوں کی دلچسپی کے لئے ''آسان عربی زبان'' کے عنوان سے ہر ماہ ایک سبق شائع کرتا تھا۔ جو پڑھے لکھے لوگوں کو بغیر استاذ کی مدد کے عربی زبان سکھانے کا ایک نیا طریقہ میں نے ایجاد کرلیا تھا۔

اس طرح ایک سال تک گاڑی کسی نہ کسی طرح چلتی رہی۔ مگر دوسرے سال تقریباً آدھے خریدار کٹ گئے تو بڑی مایوسی ہوئی۔ لہذا اب اسے ماہنامے کے بجائے ''دو ماہی'' کرنا

پڑا۔اس طرح ایک اور سال کھینچ تان کرنے کے بعد اسے ''طلاق مُغلظّہ'' دے کر ہمیشہ کے لئے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔مگر اسے چلتا کرنے سے پہلے اس کے تین چار خصوصی نمبر بھی شائع کئے جو یہ ہیں: (۱) ڈسمبر ۱۹۷۲ء میں بمبئ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کنونشن نمبر (۲) ایجوکیشنل نمبر، جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی سے متعلق تعلیمی موضوعات سے متعلق تھا، اور اس کا انعقاد نومبر ۱۹۷۳ء میں پٹنہ میں ہوا تھا ان دونوں کانفرنسوں میں راقم نے شرکت کر کے بعض تعلیمی مسائل پر اپنے مقالات پیش کئے تھے۔(۳) اسی طرح ریاست کرناٹک میں جب امارت شرعیہ قائم ہوئی تو میں نے امارت شرعیہ کے اغراض ومقاصد اور دیگر مسائل پر تعمیر فکر کے دو خصوصی شمارے امارت شرعیہ نمبر اور امارت نمبر کے عنوان سے نکالے تھے۔مگر اتنا سب کرنے کے باوجود لوگوں نے اس کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

غرض اس دو ڈھائی سال کے عرصے میں اتنی سخت محنت اور شدید جدوجہد کرنی پڑی کہ میرے جسم کے سارے کس بل نکل گئے اور میں ادھ مُوا ہو کر تقریبا چھ ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔بے یار و مددگار کوئی حال چال پوچھنے والا بھی دکھائی نہ دیا۔اسی دوران مجھے کئی طرح کے امراض نے گھیر لیا، جن میں سے ایک ذیابطیس بھی تھا۔اور دوسرا مرض پورے جسم میں ایک شدید قسم کی سوزش پیدا ہونے لگی، جس کی وجہ سے کھال پر اکثر و بیشتر سرخ دھاریاں نمودار ہو جاتی ہیں۔یہ مرض تیس سال بعد بھی اب تک باقی ہے۔مگر اب صرف سوزش ہوتی ہے دھاریاں نمودار نہیں ہوتیں۔

ندائے فرقان کا اجراء

بہر حال جب طبیعت ذرا سا سنبھلی تو اب میں نے فیصلہ کرلیا کہ ماہنامہ اب پھر کبھی نہیں نکالیں گے۔پھر ارادہ ہوا کہ اب خالص قرآنیات کے موضوع پر کچھ تحقیقی کام ہونا چاہئے۔لہذا بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ قرآنیات کا ذوق رکھنے والے اہل علم وقلم کا تعاون

حاصل کر کے ایک خالص تحقیقی رسالہ بطور سہ ماہی نکالا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بطور نمونہ دو شمارے شائع کئے تاکہ پڑھنے اور لکھنے والوں کو اس کام کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے۔ پہلے شمارے کے عنوانات اس طرح تھے: (۱) جدید علم کلام کی ضرورت (۲) قرآن مجید کا تعارف خود اُس کی زبانی (۳) قرآن مجید اور سائنس (۴) فہم قرآن کے لئے علوم جدیدہ کی اہمیت (۵) قرآن مجید اور علم جنین تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں (۶) قرآن اور بنیادی حقوق۔

ندائے فرقان کے اغراض ومقاصد یہ تھے: (۱) تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں قرآن کی حقانیت ثابت کرنا (۲) قرآنی نقطۂ نظر سے آفاقی وانفسی دلائل کی تدوین کرنا (۳) قرآن مجید کی امتیازی خصوصیات اُجاگر کرنا (۴) قرآن مجید سے جدید مسائل کا حل نکالنا (۵) قرآن مجید سے مختلف گمراہ قوموں اور فلسفوں کا ابطال کرنا (۶) قرآنی تعلیمات جدید تقاضوں کے پیش نظر جدید اُسلوب میں پیش کرنا۔

اس رسالے کے اجراء پر ہندستان کے بعض بڑے بڑے علماء نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے اچھے کلمات کا اظہار کیا تھا، جیسے مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، مولانا محمد تقی امینی مرحوم، مولانا عامر عثمانی مرحوم اور قاضی اطہر مبارک پوری مرحوم وغیرہ۔ مگر علم کی ناقدری اور کساد بازاری کی حد ہوگئی کہ اسے نہ تو اہل قلم کا تعاون ملا اور نہ پڑھنے والے ہی مل سکے۔ باہر نکل کر چندہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کیونکہ ''تعمیر فکر'' کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے نیم مُردہ سا ہو چکا تھا۔ اس لئے اس سنگلاخ سرزمین سے دل پوری طرح اُچاٹ ہوگیا۔ اور پھر مزید طرفہ یہ کہ اس دوران اکیڈمی کے لئے ڈھنگ کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں تھا۔ بلکہ گھر کے ایک گوشے ہی میں اکیڈمی اور اس کی ایک چھوٹی سی لائبریری تھی، جو اُس وقت تقریباً ایک ہزار کتابوں پر مشتمل تھی۔ ان ہمت شکن حالات کے باعث دل بالکل شکستہ ہو کر رہ گیا۔ اور مجھے رہ رہ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا کہ میں کسی لق ودق صحرا میں اذاں دے رہا ہوں۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔

شمالی ہند کا سفر

لیکن چونکہ میں قرآن کا ''پیالہ'' پی چکا تھا، بلکہ بقول حکیم عبدالمنتقم خان دانش بنگلوری مرحوم ''قرآن اور سائنس کو گھول کر پی چکا تھا'' اس لئے قرآن کا یہ نشہ میرے سر سے کبھی نہ اُتر سکا۔ بلکہ وہ ہمیشہ میرے رگ و پے میں سرایت کر کے مجھے آمادہ عمل بنائے ہوئے تھا۔ طبیعت میں ہر وقت ایک عجیب قسم کی بے چینی و بے قراری رہتی تھی جو مجھے کبھی ایک جگہ سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ اور آج ۲۰۰۲ء میں بھی میرا یہی عالم ہے۔ بہر حال میں ہمیشہ مشکلات سے گھبرائے بغیر نئے نئے انداز میں سوچتا اور نئے نئے منصوبے بنایا کرتا رہا ہوں۔ کسی بھی طرح نچلا بیٹھنا میری طبیعت کے خلاف ہے۔

لہذا کافی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب بنگلور میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، کیونکہ یہاں پر میری آواز صدا بصحرا ثابت ہورہی ہے۔ اس لئے اب کہیں اور چل کر قسمت آزمائی کی جائے۔ چنانچہ میری نظر شمالی ہند کے چار مراکز علم پر پڑی: دلی، علی گڑھ، لکھنؤ اور دیوبند۔ میں نے سب سے پہلے دلی جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ اور میری نگاہ میں حکیم عبدالحمید دہلوی مرحوم کا قائم کردہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تھا، جو نیا نیا قائم ہوا تھا اور اس کی بڑی شہرت ہوگئی تھی۔ میں نے دلی جانے سے پہلے ہی اپنی کتابیں اور ندائے فرقان کے دو شمارے بھیج دئے تھے اور ایک خط بھی تحریر کر کے لکھ دیا تھا کہ اگر وہ پسند فرمائیں تو آپ ندائے فرقان کو اپنا لیجئے اور مجھے اپنے ادارے میں بیٹھ کر کام کرنے کا موقع دیجئے۔ انشاءاللہ یہ ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ چنانچہ جب میں نے دلی جا کر اُن سے ملنا چاہا تو اُنھوں نے ملاقات کا وقت ضرور دیا مگر مجھے اپنے ادارے میں جگہ دینے کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرادی کہ ''آپ ایک اچھا کام کر رہے ہیں اور آپ کا کام کافی آگے بڑھ چکا ہے، لہذا آپ اسے وہیں بیٹھ کر انجام دیجئے''۔

یہاں سے نکل کر علی گڑھ گئے اور مولانا محمد تقی امینی صاحب کو اپنی بپتا سنائی تو وہ بہت متاثر ہوئے اور قوم کی قدر ناشناسی پر افسوس کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ میں آپ کو علی گڑھ میں فٹ ہونے کے لئے کوئی جگہ تلاش کروں گا۔ یہاں سے نکل کر دیوبند گئے اور وہاں دو تین روز رہ کر حالات کا جائزہ لیا تو یہاں کا ماحول کچھ سازگار نہیں آیا۔ یہاں سے نکل کر سب سے آخر میں لکھنوٴ کی راہ لی۔ اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے رائے بریلی میں ملاقات کر کے اپنی داستانِ عبرت سنائی اور درخواست کی کہ اگر ندوہ میں میرے لئے اس موضوع پر کام کرنے کا موقع دیا جائے تو میں یہ کام اطمینان اور سکون کے ساتھ کر سکوں گا۔ مگر حضرت موصوف نے میری صلاحیتوں پر شک کرتے ہوئے فرمایا کہ اس باب میں کوئی ایم ایس سی ڈگری ہولڈر بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر کچھ دیر بعد فرمایا کہ اگر آپ عیسائیت کے خلاف تحقیقی کام کرنا چاہیں تو ندوہ میں ضرور اس کا ایک شعبہ کھولا جا سکتا ہے۔ عیسائیت کا موضوع میرے لئے نامانوس تو نہیں تھا، کیونکہ میں نے ندوہ سے عالمیت کی سند لیتے وقت قرآن اور بائبل کے موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ چکا تھا، مگر اس موضوع سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے میں ادباً خاموش ہو گیا۔ بہر حال حضرت کے اس جواب سے وقتی طور پر تھوڑی سی دل شکنی ضرور ہوئی مگر حضرت والا کی خصوصی دعائیں میرے ساتھ تھیں، چنانچہ حضرت والا نے میری اشک شوئی کی خاطر ایک تحریر میرے حوالے کر دی جو قوم کے نام ایک اپیل کے طور پر تھی، جو یہ ہے:

”کسی ملک اور قوم میں علمی و تصنیفی اداروں کا وجود ایک ایسا پیمانہ ہے، جس سے ہم اس قوم کی علمی سطح اور علمی و ادبی مذاق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے ادارے زیادہ سے زیادہ قائم ہوں اور مختلف شعبوں میں دینی خدمات انجام دیں۔

فرقانیہ اکیڈمی جو چند سال سے بنگلور میں قائم ہوئی ہے، اور قرآن مجید اور علوم جدیدہ کے موضوع پر اس نے قلیل عرصہ میں مفید کتابیں شائع کی ہیں، اسی قسم کے مفید اور ضروری اداروں میں ہے، جو ہمت افزائی اور تعاون کے مستحق ہیں۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اس اکیڈمی کو (جو عزیز ندوی فاضل مولوی شہاب الدین ندوی کی تنہا کوششوں اور محنت و عرق ریزی کا نتیجہ ہے) وہ تعاون اور ہمت افزائی حاصل نہ ہوسکی جس کے بعد وہ اس سے زیادہ مفید ثابت ہوسکتی تھی، اور اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت انجام دے سکتی تھی۔ مجھے امید ہے کہ ملک کے علم دوست اور قرآن و علوم جدیدہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے دلچسپی لیں گے، اور جہاں تک ممکن ہوگا اس سے تعاون کریں گے۔"

اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی اس ناچیز کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل تحریر عنایت کی تھی:

"جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی اور ان کا ادراہ فرقانیہ اکیڈمی بنگلور عصری ضرورت کے تحت جن علمی و تحقیقی خدمات میں مصروف ہے ان سے اہل علم کافی حد تک روشناس ہو چکے ہیں۔ اور یہ ناکارہ تو مولانا کی متعدد تصانیف سے کافی متاثر اور کافی مستفید بھی ہُوا ہے۔ اس ذیل میں مولانا موصوف نے اب سہ ماہی مجلّا "ندائے فرقان" جاری کیا ہے جس کا اولین مقصد تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کرنا ہے۔ نیز اسی طرح دین کے مقاصد مہمہ بھی ان کے پیش نظر ہیں۔ الحمد للہ کہ یہ ایک مبارک اقدام اور وقت کی نبض شناسی ہے۔ جس کے ذریعہ اصول دین، اور ذوق نبوت کی صحیح ترجمانی کی جارہی ہے۔

دعا ہے کہ رب کریم مولانا موصوف اوران کے ادارے سے دین حق کی صحیح خدمت لے اور انہیں اس مسلک مستقیم پر کام کرنے کی زیادہ سے زیادہ ہمّت اور توفیق ارزانی فرمائے اوراس کے مُفید ثمرات سے اُمت کو مستفیض ہونے کے مواقع میسر فرمائے۔ آمین! ایں دُعااز من واز جملہ جہاں آمین باد۔''

بنگلورواپس آ کرمیں نے نئے سرے سے اپنے کاموں کا جائزہ لیااور نئے سرے سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر صحافتی زندگی سے توبہ کرکے اپنی ساری توجہ اپنے محبوب موضوع پر تحقیقی کام کے لئے وقف کردی، وہ موضوع جس سے مجھے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ پھراس کے ساتھ ہی اپنے مطلب کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کرخریدتا اوراپنی لائبریری کوبھی ترقی دیتا رہا۔

حج بیت اللہ کی سعادت

خوش قسمتی سے مجھے ۱۹۷۷ء میں حج سے مشرف ہونے کا موقع ملا۔ جس کی سعادتوں اور برکتوں کے باعث میری مرادیں ایک ایک کرکے پوری ہوتی گئیں۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، لہٰذا مختصر طور پر عرض ہے کہ جب حرم شریف پر پہلی نظر پڑی تو دل ودماغ بے قابواور جذبات مچل گئے، ایک عجیب قسم کی مدہوشی کا عالم طاری ہوگیا۔ حرم شریف کے انواراوراُس کی تجلیوں سے ایک ایسا روحانی کیف طاری ہوگیا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔ کعبۃ اللہ کے پردے پکڑ کر اوراُس کی چوکھٹ پر سر رکھ کرالحاح وزاری کے ساتھ دعائیں کیں اور ہر مقدس مقام پر زار زار روتے ہوئے نہایت درجہ خضوع وخشوع کے ساتھ دعا مانگی پھر مسجد نبوی میں حاضری دے کرادب واحترام کے ساتھ سلام پیش کیا اور گڑگڑا کر دعائیں کیں۔ اور میں نے اپنی بے بسی وبے کسی کا شکوہ دربار نبوی میں کیا اور قوم کی ناقدری وبے التفاتی کا رونا روتے رہے۔ ''روضۃ'' میں پہنچ کر دیر تک نوافل اور دعاؤں میں مشغول رہنے اور ''صُفّہ'' پر پہنچ کر گھنٹوں تلاوت قرآن کرتے ہوئے

فہم قرآن کے لئے آہ وزاری کرتے رہے۔

مکہ مکرمہ میں میرا قیام مدرسہء صولتیہ میں تھا۔اس کے مہتمم حضرت مولانا شمیم صاحب مرحوم میرے مضامین اور کتابوں کی بنا پر پہلے ہی سے متعارف تھے۔اور موصوف نے مجھے پہلے ہی سے دعوت دے رکھی تھی کہ میں جب کبھی مکہ مکرمہ آؤں تو مدرسے میں قیام کروں۔ چنانچہ وہ اور اُن کے صاحبزادے مولانا حشیم صاحب اور مولانا زعیم صاحب عرف احمد سعید سب بڑے تپاک سے ملے اور میری کافی آؤ بھگت کی۔ بہرحال مناسک حج سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مکہ مکرمہ کے تمام مکتبے چھان کر اپنے مطلب کی کتابیں خوب خریدیں۔اور اس سلسلے میں مولانا شمیم صاحب اور بعض دیگر احباب نے بھی کافی مدد کی۔خصوصیت کے ساتھ اپنے ندوہ کے ایک ساتھی مولانا عبدالقیوم ندوی ازہری جو آج کل ڈاکٹر ہیں اور جدہ میں مقیم ہیں، کی مہربانی سے بھی کتابوں کی خریداری میں کافی تعاون ملا۔ان سب حضرات کی مہربانیوں کی بدولت کتابوں کا ایک ڈھیر جمع ہوگیا۔چونکہ میرا سفر پانی کے جہاز سے تھا اس لئے کتابیں بمبئی لانے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہوئی۔اس طرح فرقانیہ اکیڈمی کے لئے پہلا سب سے بڑا کتابوں کا تحفہ مکہ مکرمہ، شرّفہا اللہ تعالیٰ، سے ملا، جو باریٔ تعالیٰ کی عنایت خصوصی تھی، تاکہ میں اُس کی راہ میں سرفروشانہ طور پر علمی جہاد کا فریضہ انجام دے سکوں۔ بندہ اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہا تھا کہ ایک تو حج کی سعادت سے مشرف ہوا اور دوسرے یہ کہ مجھے اپنی پسند کی ڈھیروں ساری کتابیں مل گئیں، جو میرے لئے دنیا کی سب سے بڑی دولت تھی۔

جب تک مکہ مکرمہ میں قیام رہا خوب طواف کرتے اور زمزم پی کر دعاؤں میں مشغول رہا کرتے تھے۔اس موقع پر بندہ نے باری تعالیٰ سے کعبۃ اللہ کی چوکھٹ پکڑ کر ایک خصوصی دعا یہ بھی مانگی تھی کہ وہ مجھے کم از کم ایک سو کتابیں لکھنے کی توفیق دے۔الحمدللہ عنقریب یہ تعداد پوری

ہونے والی ہے۔ قیام مکہ کے دوران مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی سے بھی خصوصی ملاقات ہوئی جو میرے علمی کام سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ میں نے اُن کو جب اپنی رودادِ غم سنائی تو اُنھوں نے مجھے سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبداللہ بن عبدالعزیز بن باز سے ملایا جن کی نظر کرم کی وجہ سے مجھے ایک اور خصوصی تحفہ ملا جو بعد میں چل کر اکیڈمی کی ترقی کا باعث بنا۔ اس طرح بندہ فیوض حرمین سے مالا مال ہو کر گھر واپس ہوا۔ مدینہء منورہ میں مولوی علی احمد ندوی پٹنی (جو آج کل ڈاکٹر بن گئے ہیں) نے میری بڑی خدمت کی جو میری کتابوں کے شائق اور قدردان تھے۔ وہ اُس وقت مدینہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔

مکہ مکرمہ کے دوران قیام کئی بار رابطہء عالم اسلامی جانا ہوا، جو پہلے عزیزیہ میں تھا۔ یہاں کے ایک عہدہ دار استاذ محمد محمود الحافظ سے ملاقات ہوتی تھی، جو اصلاً سوریا (شام) کے تھے، مگر وہ میری ندوی زندگی کے معاصر تھے، جب کہ وہ ایک خصوصی طالب علم کی حیثیت سے ندوہ میں مقیم تھے۔ ندوہ میں ان سے خوب ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس بنا پر اُنھوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا اور بڑے تپاک سے ملے۔ وہ اس موقع پر رابطہ کے شعبہء صحافت کے انچارج تھے۔ چنانچہ ان ہی کی نظر کرم کی بنا پر میری پہلی عربی کتاب ''بین علم آدم والعلم الحدیث'' رابطہ سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ جسے میں نے اپنے دوسرے حج کے دوران ان کے حوالے کیا تھا۔

رابطہ کے پہلے سکریٹری جنرل شیخ صالح القزاز کا انتقال میرے سفر حج سے کچھ ہی عرصے پہلے ہو چکا تھا، جن سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ کیونکہ اُنھوں نے سہ ماہی ''ندائے فرقان'' کا پہلا شمارہ دیکھ کر (حالانکہ وہ اردو میں تھا اور غالباً کسی سے پڑھوایا ہوگا) بڑے اچھے تاثرات لکھ بھیجے تھے، جو میرے لئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''آپ کے رسالے ''ندائے فرقان کا پہلا شمارہ موصول ہُوا۔اور اس کے بیش قیمت اسلامی مقالات و مضامین سے آگاہی ہوئی۔ ہم آپ کے مشکور ہوں گے اگر آپ اپنے رسالے کے مزید اس طرح کے شمارے ہمیں بھیج سکیں۔اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کو عزم و استقلال عطا فرمائے اور آپ کے مساعی کو جو اس کی تعلیمات دین کی اشاعت کے لئے ہے قبول فرمائے اور آپ کے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین۔''

چنانچہ موصوف نے انتقال سے پہلے رابطہ کو میرے بارے میں ایک ''وصیت'' کر دی تھی جس کا فائدہ مجھے سفر حج سے واپسی کے بعد ۱۹۷۸ء میں ملا۔

رابطہ میں اُس وقت کے سکریٹری جنرل شیخ محمد علی الحرکان سے اور دیگر اصحاب سے ملاقات ہوئی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے انہیں بعض کتابیں پیش کیں، جو اُس وقت اردو میں تھیں۔ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ جا کر وہاں کی لائبریری دیکھی جو بہت بڑی اور وسیع تھی۔اس میں اردو کی بھی کچھ کتابیں تھی۔لہذا میں نے اپنی تصنیفات بھی اس میں رکھوادیں۔لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین ڈاکٹر مطیع الرحمان ندوی ازہری سے ملاقات کر کے اپنا تعارف کرایا تو وہ بڑے تپاک سے ملے اور لائبریری کی جانب سے بعض بیش قیمت علمی کتابیں بطور تحفہ عنایت کیں۔ان میں سے ایک سُنن ابی داؤد بھی تھی جو جدید انداز میں ایڈیٹ کردہ اور انڈکس کے ساتھ پانچ جلدوں میں سوریہ (شام) سے شائع ہوئی تھی۔

فرقانیہ اکیڈمی کی شاندار لائبریری

پھر اس کے بعد ۱۹۸۶ء میں دوسرا حج، ۱۹۹۰ء میں تیسرا اور ۱۹۹۵ء میں چوتھا حج کرنے اور ۱۹۹۳ء میں عمرہ کرنے کی سعادت ملی۔اور ہر مرتبہ کتابوں کا ایک انبار آتا گیا، جو ایرکارگو کے

ذریعہ سیدھے بنگلور منتقل ہوتا رہا۔ کیونکہ بعد کے تمام اسفار ہوائی جہاز سے ہوئے تھے۔اس طرح بار بار حج کی سعادتوں اور برکتوں کے علاوہ ''منافع حج'' سے بھی خوب مستفید ہوتے رہے۔ میرا خاص نشانہ تفسیر، حدیث اور قرآنیات سے متعلق کتابیں تھیں۔ پھر دبئ اور مصر وغیرہ سے بھی ڈھیروں کتابیں خرید خرید کر انہیں بنگلور منتقل کیا گیا۔اردو کی کتابیں زیادہ تر پاکستان جاکر خریدیں اور وہ بڑی آسانی سے بنگلور منتقل ہوگئیں۔بعض اوقات کافی مشقتیں بھی برداشت کرنی پڑیں،مگر اس کام میں بڑا مزہ آرہا تھااور ایسی روحانی مسرت ہوتی تھی جو بیان سے باہر ہے۔

غرض اس وقت فرقانیہ اکیڈمی کے کتب خانے میں لگ بھگ چالیس ہزار کتابیں جمع ہوگئی ہیں جوایک سے بڑھ کرایک ہیں۔اور خصوصا قرآنیات اور جدید مسائل وموضوعات پر جو منتخب کتابیں اس میں موجود ہیں وہ ہندستان کی شاید ہی کسی لائبریری میں ہوں۔ اس میں ''کمیت'' سے زیادہ ''کیفیت'' ہے۔فالحمدللہ علی ذلک۔

چنانچہ حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی مدظلہ، مہتمم وقف دار العلوم دیوبند نے اب سے چندسال پہلے ہماری لائبریری دیکھ کرفرمایا تھا کہ:

''۔۔۔اکیڈمی میں فراہم کردہ عظیم علمی ذخیرۂ کتب کو دیکھ کر خیال آیا کہ جسطرح حیدرآباد کا ''سالار جنگ میوزیم'' صرف ایک آدمی کے ذوق، محنت اور بیدریغ دولت صرف کرنے کے لحاظ سے منفرد شمار کیا جاتا ہے، اسی طرح فرقانیہ اکیڈمی کی لائبریری کی عظمت ووسعت اور لاکھوں لاکھ روپۓ کا ذخیرۂ کتبِ ثمینہ مولانا شہاب الدین صاحب زید مجدہ کے علمی، دینی اور اصلاحی ذوق کی انفرادیت کا آئینہ دار ہے۔ ملک میں لائبریریاں اس سے بڑی ضرور موجود ہیں، لیکن فرد واحد کی فراہم کردہ اس شاہکار لائبریری کی کوئی مثال شاید یہ ملک نہ پیش کرسکے۔علمی تحقیق پسند حلقے اور ریسرچ اسکالرس کے لئے یہ لائبریری ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔''

اس طرح شہر بنگلور جو ایک عرصہء دراز سے ''وادئ غیــــر ذی ذرع '' بنا ہوا تھا وہ اب علم کی بادِ بہاری سے لہرا کر جھوم رہا ہے۔ الـلھـم زد فزد ۔ ''کلامیاتِ قرآن'' پر کام کرنے والوں کے لئے یہ لائبریری ایک بیش بہا علمی خزانہ ہے، جس میں عربی، اردو اور انگریزی میں کافی مواد اکھٹا ہو گیا ہے۔ اور اس میں علم کلام کی قدیم کتابوں کا بھی بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لیکن اس موضوع پر کام کرنے والا دور دور تک کوئی بھی شخص دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کیونکہ اس ہفت خواں کو طے کرنے کے لئے ایک ''بحر العلوم'' جیسی شخصیت درکار ہے، جو بالکل عنقا ہے۔ اور اس میں ناچیز بھی کچھ زیادہ نہیں کر سکا ہے۔ مگر یہ کہ بندہ نے اس راہ میں اپنی بساط کے مطابق جتنا بھی کر سکتا تھا اُس میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ یہ عظیم کام ایک ٹیم ورک کے بغیر ہرگز پائے تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر ہماری اُمت میں چند افراد بھی اُٹھ کھڑے ہوں تو اس میدان میں پیش رفت ہو سکتی ہے۔ مگر سوال یہ کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟

فرقانیہ اکیڈمی ایک نئی منزل میں

حرمین شریفین کے فیوض و برکات سے مالا مال ہو کر ساڑھے تین ماہ بعد جنوری ۱۹۷۸ء میں گھر واپس ہوا اور ایک نئے عزم و حوصلے کے ساتھ کام کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے بفضل ایزدی ایک چھوٹی سی مگر خوبصورت عمارت بنائی، جو خداوند کریم کا ایک ''عطیہء خصوصی'' تھی۔ اس میں لائبریری سجائی گئی اور ایک باقاعدہ دفتر بھی قائم ہو گیا۔ یہ عمارت اپنی ذاتی نگرانی میں ۱۹۷۹ء میں بن کر تیار ہوئی جس کا افتتاح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مگر مقامی لوگوں کے لئے یہ اکیڈمی ایک فتنہ بن گئی اور وہ میرے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ یہ ایک اندوہناک کہانی ہے جس پر تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس طرح بندہ کے لئے ابتلاء و آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

مگر مجھے کسی بھی چیز کی قطعاً پرواہ نہیں تھی اور میں اپنے کام میں ایک دیوانے کی طرح مشغول رہا۔ اگرچہ وقتی طور پر تھوڑی سی رنجش ضرور پیدا ہوجاتی تھی مگر مجموعی اعتبار سے میں اپنا کام پورے صبر وسکون کے ساتھ کرتا رہا۔ اسی عرصے میں ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں'' لکھ ڈالی جو بعد میں پاکستان سے شائع ہوئی۔ سہ ماہی ''ندائے فرقان'' میں رسالے کے جن اغراض ومقاصد کا اعلان کیا گیا تھا ان کو اکیڈمی کا ایک منشور قرار دے کر انہیں کے مطابق اب اپنی تمام کتابیں لکھنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اس کے بعد جتنی بھی کتابیں تصنیف کی گئیں وہ سب انہیں اُصولوں کے تحت تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ''ندائے فرقان'' جیسا ایک خالص قرآنی رسالہ ہماری اُمت کی ذہن سازی کے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر اُمت کو اس کا کوئی شعور ہی نہیں ہے۔ لہذا یہ میدان پوری طرح خالی پڑا ہے۔

بہر حال اکیڈمی کے سامنے قرآن کی حسب ذیل دو آیتیں ہمیشہ ایک ''لوگو'' یا ٹریڈ مارک کی حیثیت سے سامنے رہیں:

﴿ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدىٰ وَالْفُرْقَانِ . ﴾ (بقرہ: ۱۸۵)

ترجمہ: (یہ قرآن) تمام لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل میں فرق کرنے والے واضح دلائل موجود ہیں۔

﴿ تَبَارَکَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلىٰ عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا. ﴾

(فرقان: ۱)

ترجمہ: بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان (کسوٹی) نازل کی تا کہ وہ سارے جہاں کو خبردار کر سکے۔

اس نقطۂ نظر سے اس عرصے میں علمی وکلامی مسائل پر بعض معرکے کی کتابیں تصنیف

کرڈالیں، جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ان کے علاوہ حسب ذیل کتابیں بھی منظر عام پر آئیں: (۱) قرآن کا پیغام اور اُس کے علمی اسرار و عجائب (۲) اسلام میں علم کا مقام و مرتبہ (۳) ہمارے تعلیمی مسائل (۴) اسلام اور جدید سائنس (۵) بیع مرابحہ اور اسلامی بنک کاری۔ آخری کتاب ایک مقالہ ہے جو ۱۹۹۰ء میں اسلامی فقہ اکیڈمی کے سمینار منعقدہ بنگلور میں پیش کیا گیا تھا۔

اس دوران کئی ایک افراد کو باری باری اکیڈمی کے رفیق کار کے طور پر رکھا مگر کوئی بھی اس لائن میں دو چار قدم سے آگے نہ بڑھ سکا۔لہذا یہ سارا سفر مجھے اکیلے ہی طے کرنا پڑا۔ جب میرے تین لڑکے یکے بعد دیگرے ندوہ سے فارغ ہو کر آ گئے تو مجھے کچھ راحت ملی اور میں انتظامی اُمور سے بہت بڑی حد تک آزاد ہو گیا۔ان کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔ہاں البتہ میرے ایک بھتیجے عبداللہ زبیر اور میرے بڑے لڑکے مولوی شفیق الرحمٰن نے کچھ سال میرا خوب ساتھ دیا، جس کی بنا پر کتابوں کی اشاعت زوروں پر رہی۔

دارالشریعہ کا قیام

ہندستان جیسے ملکوں میں اسلامی شریعت یا مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کا مسئلہ اہم ہی نہیں بلکہ سرفہرست ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی جائے۔مگر اس سلسلے میں محض جلسے جلوسوں یا ''دستوری تحفظات'' حاصل کر لینے سے یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے لئے علمی و عقلی میدان میں جدوجہد کر کے اسلامی شریعت کی خوبیوں اور اُس کے عقلی محاسن کو سامنے لانا ضروری ہے۔تاکہ فرقہ پرستوں کو اسلامی قوانین کے ''غیر عقلی'' ہونے کا بہانہ کر کے ان پر دست درازی کرنے کا کوئی بہانہ باقی نہ رہے۔مگر حیرت کی بات ہے کہ عام علماء تو درکنار مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسا بااختیار ادارہ بھی اس معاملے میں بالکل خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔اور

وہ غفلت کی نیند سے اُس وقت چونکتا ہے جب پانی سر سے اونچا ہورہا ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی شریعت پر تحقیقی کام کرنے کے لئے دو چار اہل نظر علماء کو مقرر نہیں کیا جاسکتا؟ کوئی جلسہ کرنے یا کورٹ کچہری کے چکر لگانے کے لئے لاکھوں روپئے خرچ کردئے جاتے ہیں، تو کیا تحقیقی کاموں پر رقم نہیں لگائی جاسکتی؟ حالانکہ باریٔ تعالیٰ نے خالص شرعی مسائل میں بھی غور وفکر کرکے ان کی عقلی حکمتیں اور مصلحتیں دریافت کرنے کا حکم دیا ہے۔ (دیکھئے سورہ بقرہ:۲۱۹)

ارباب ملت کی اس بے حسی کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں نہ اکیڈمی کے ماتحت اسلامی شریعت پر تحقیق کا ایک شعبہ کھولا جائے، جس میں دو چار افراد کو رکھ کر اسلامی قوانین کی معقولیت کے دلائل معلوم کئے جائیں۔ اور مجھے اُمید تھی کہ اس موضوع پر کام کرنے کے لئے کچھ باصلاحیت اہل علم ضرور مل جائیں گے، کیونکہ اگر وہ سائنسی علوم سے ناواقفیت کے باعث کلامی مسائل پر کام نہیں کرسکتے تو کیا ہوا شرعی وفقہی مسائل میں تو چل ہی سکیں گے۔ یہ سب سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ ''دارالشریعہ'' کے نام سے فرقانیہ اکیڈمی کا شعبہ کھولا جائے۔

چنانچہ ۱۹۹۳ء میں جب کہ اکیڈمی شہر سے باہر ایک مضافاتی علاقے میں تھی اُسے شہر منتقل کرنا ضروری معلوم ہوا اور اس کا ایک دوسرا سبب بھی تھا کہ وہ علاقہ ہمارے لئے بڑا ہی ''دل آزار'' ثابت ہوا تھا۔ اور یہ ایک تلخ داستان ہے۔ اور اس کا ایک تیسرا سبب یہ تھا کہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی شہادت کے بعد وہ علاقہ ہمارے لئے ''غیر محفوظ'' نظر آرہا تھا۔ کیونکہ وہاں پر غیروں کی کثرت تھی۔ ان اسباب کی بنا پر ہم کو اپنے مقام سے ہجرت کرکے شہر کے ایک مسلم علاقے میں جانا پڑا۔ اور پھر اس کا چوتھا سبب یہ بھی تھا کہ مسلم معاشرہ کو چونکہ سائنسی علوم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اس لئے اکیڈمی کو ایک ''عجوبہ'' تصور کرتے ہوئے اس کے سائے سے بھی بھاگنے کی

کوشش کرے گا۔ لہذا عوام کو رجھانے اور اسے ادارے سے قریب کرنے کے لئے ''اسلامی شریعت'' کا پرکشش سہارا لینا ضروری ہے۔ غرض ان تمام وجوہات کی بنا پر نئی جگہ پہنچ کر ایک سائن بورڈ لگوایا جس میں اوپر ''دار الشریعہ'' اور نیچے ''فرقانیہ اکیڈمی: ریسرچ لائبریری اور تحقیقی مرکز'' درج کرایا۔

اس کا افتتاح ۱۲ستمبر ۱۹۹۳ء کو بہت دھوم دھام سے کرایا گیا اور اس مقصد کے لئے ایک بہت بڑا اور شاندار جلسہ منعقد کرایا گیا، جس میں عمائدین شہر اور عوام کا ایک ہجوم تھا۔ اور اس کے افتتاح کے لئے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔ دار الشریعہ کے قیام کی تشہیر و تحسین نہ صرف ہندستان بھر کے اخبارات میں بلکہ بیرونی ممالک کے اخبارات میں خوب ہوئی۔ چونکہ یہ عصر جدید کا ایک اہم ترین مسئلہ اور وقت کی آواز تھی اس لئے ''مسلم پریس'' نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا اور بھرپور طریقے سے ہمارا ساتھ دیا۔ یہ ادارہ شہر کے ایک مرکزی علاقے میں تھا، اس لئے اکیڈمی کی عظیم الشان لائبریری عوام کے استفادے کے لئے کھول دی گئی۔ مگر یہاں آنے کے بعد نہایت درجہ عجیب وغریب اور تلخ تجربات کا سامنا ہوا جسے بیان کرنے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ مگر بندہ کبھی مایوس نہیں ہوا اور ہمت نہیں ہاری۔ کیونکہ میرے پیش نظر ایک اعلی مقصد کے لئے جدو جہد ہی نہیں بلکہ جہاد کرنا تھا۔ لہذا میں اپنے آپ کو ہر قسم کے ''آتش کدوں'' میں جھونکنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ تاکہ اس اُمت کو بیدار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ اس لئے کسی بھی قسم کی دل شکنی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہمیشہ آگے کی طرف ہی دیکھتا رہا۔

الغرض اب میری ایک ہی دھن اور ایک ہی فکر تھی کہ اسے ہندستان میں ایک ماڈل قسم کا تحقیقی مرکز بنایا جائے، جس میں ایک طرف فکری وکلامی اور سائنسی نقطۂ نظر سے کام ہو تو دوسری

طرف شرعی وفقہی مسائل پر کام کر کے اسلامی شریعت کی معقولیت بھی ثابت کی جائے، تا کہ اسلام عصر جدید میں ''معقولی'' اعتبار سے ایک مکمل دین اور مکمل شریعت کا حامل نظر آئے اور اسلام اور اس کی شریعت کا اصل اعجاز ظاہر ہو۔ مگر یہ مقصدِ عظیم چند ''گرجدار'' قسم کی تقریریں کر دینے یا زبانی طور پر اسلام کے ''فضائل'' بیان کر دینے یا اسلامی قانون وشریعت کی ''قصیدہ خوانی'' کر دینے سے کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ عصر جدید کے فکری پیمانے بدل چکے ہیں اور آج کا انسان جدید سائنس اور جدید فلسفے کے زیر اثر ہونے کی بنا پر اس قدر ''عقلیت پسند'' بن چکا ہے کہ وہ کسی بھی عقیدے اور اخلاقی ضابطے کو ماننے کے لئے تیار دکھائی نہیں دیتا، جب تک کہ اُس کی معقولیت کے دلائل علمی وعقلی نقطۂ نظر سے اُس پر واضح نہ کئے جائیں۔ اور جب تک علم وعقل کی بنیاد پر موجودہ انسانوں کے ذہنی شکوک وشبہات دور نہ کئے جائیں عصر جدید پر اسلام کی حجت پوری نہیں ہوسکتی۔

یہ وہ احساس تھا جو راقم کو اپنی پوری زندگی میں ہمیشہ بے چین رکھا اور یہی ایک واحد فکر تھی جو میرے دل ودماغ پر ایک بھوت کی طرح چھائی رہی۔ اور اس بنا پر کھانے پینے کا بھی کوئی ہوش نہیں رہتا تھا۔

غرض دار الشریعہ کے قیام کا اعلان کرنے کے بعد اب فکر ہوئی کہ اسے عملی جامہ کس طرح پہنایا جائے؟ لہذا سب سے پہلے اس کے اغراض ومقاصد کی تشہیر کرنے کی غرض سے اخبارات میں اس کی ضرورت واہمیت پر مضامین لکھے گئے اور پھر اردو، عربی اور انگریزی میں بعض کتابچے، بلیٹن اور پمفلٹ وغیرہ چھپوا کر وسیع پیمانے پر اس کی تشہیر کی گئی۔ اور پھر بعض بڑے بڑے علماء سے ربط قائم کر کے اُن کی تائید حاصل کی گئی۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تحریر فرمایا تھا:

میری علمی زندگی کی داستانِ عبرت

''یہ وقت کا اہم اور ٹھوس کام ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے قیام و تکمیل کا سامان فرمائے۔ اس میں کہیں اختلاف کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے قیام وخدمت کی صلاحیت بھی عطا فرمائی ہے''۔

اس قسم کی تائیدوں سے حوصلہ بلند ہوا تو اب فکر ہوئی کہ اس کے لئے افراد کیسے اور کہاں سے اکھٹا کئے جائیں؟ کیونکہ یہ ایک بہت ہی اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ کیونکہ آج کل علم کا معیار اتنا پست ہو چکا ہے کہ کسی باصلاحیت فرد کو ڈھونڈھ نکالنا جُوئے شِیر لانے سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس بنا پر اگر اخبارات میں اعلان کر دیا جائے تو ہمارے دروازے پر لوگوں کی ایک ''بھیڑ'' ضرور جمع ہو جائے گی، مگر وہ کسی بھی طرح ہمارے کام کے نہ ہوں گے۔ یہ احساس ہمیشہ سوہان رُوح بنا رہا۔ میں اکیلا کیا کرتا اور کن کن موضوعات پر کام کرتا؟ میرے سامنے تو مسائل و موضوعات کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا اور طبیعت میں ایک اضطرابی کیفیت تھی جو کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

لہٰذا کافی سوچ بچار کے بعد بعض چوٹی کے علماء کو خطوط لکھے گئے کہ کچھ باصلاحیت علماء کی نشاندہی کی جائے، جن کو معقول وظیفہ دیا جائے گا۔ کسی نے جواب میں کہا کہ ''ایسے افراد کو تلاش کرنا پڑے گا'' تو کسی نے کہا کہ ''اس کام کے لئے آپ کو خود تربیت کرنی پڑے گی''۔ اس قسم کے صلاح ومشورے کے بعد دل مسوس کر رہ جانا پڑا کہ یہ کیسی ملّت ہے جو نہ تو عصر جدید کے چیلنجوں کو سمجھ سکی ہے اور نہ اس کے مقابلے کے لئے افراد کو پیدا کر سکی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ زندہ قوموں کی علامت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہر سال مدرسوں سے سیکڑوں افراد جو ''فارغ'' ہو کر نکلتے ہیں اُن کا ''مصرف'' کیا ہے اور وہ کس کام کے ہیں؟ اس پر اربابِ مدرسہ کو ٹھنڈے دل اور پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہئے۔

اسلامی شریعت کی فریادرسی

الغرض اسلامی شریعت کے تحفظ کا مسئلہ محض چند دستوری تحفظات ''بطور بھیک'' حاصل کر لینے سے کبھی حل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ ''اقدامی'' طور پر حملہ آور ہوتے ہوئے ''معقولیت پسندی'' کے دعویداروں کی زبان بند نہ کی جائے اور عقلی واستدلالی نقطۂ نظر سے اُن پر اللہ کی حجت پوری نہ کی جائے۔ اس لحاظ سے آج شریعت الٰہی یا خدا کا قانون خود اہل شریعت سے شکوہ سنج ہے کہ خدارا میری معقولیت کو سمجھو اور مجھ پر غیروں کی دست درازیوں کے تاریک سائے پڑنے سے بچاؤ۔ چنانچہ باریٔ تعالی نے جس طرح فکری وکلامی (فلسفیانہ) مسائل میں غور وخوض کر کے دلائل رُبوبیت کی تحقیق وتدوین کرنے کا حکم دیا بالکل اسی انداز میں خالص شرعی وفقہی احکام ومسائل میں بھی غور وفکر کرنے اور ان کے عقلی وعلمی حکمتوں اور مصلحتوں کی تحقیق کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں خالص شرعی احکام کے ذیل میں حسب ذیل آیات مذکور ہیں:

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ. ﴾ (بقرہ: ۲۱۹)

ترجمہ: اللہ اسی طرح تمہارے لئے (اپنے) احکام کی وضاحت کرتا ہے تا کہ تم (ان میں) غور کرسکو۔

اسی طرح غیر مسلم مرد اور غیر مسلم عورت سے نکاح نہ کرنے کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَيُبَيِّنُ اٰيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. ﴾ (بقرہ: ۲۲۱)

ترجمہ: وہ اپنے احکام لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے، تا کہ وہ متنبہ ہوسکیں۔

پھر اس کے بعد حیض، طلاق، عدت، خُلع، رضاعت، مہر اور متعہء طلاق وغیرہ متعدد مسائل کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمْ اٰیَاتِهٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ. ﴾ (بقرہ: ۲۴۲)

ترجمہ: اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنے احکام کی وضاحت کرتا ہے تا کہ تم عقل سے کام لے سکو۔

اسی طرح سورۂ نور میں ایک دوسرے اُسلوب میں شرعی احکام ومسائل پر غور وخوض کرنے اوران کی عقلی حکمتوں کی دریافت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ نور تو زیادہ تر شرعی احکام ومسائل ہی پر مشتمل ہے اوراُس میں چار جگہوں پر ان میں غور وخوض کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر پہلی جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَیُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیَاتِ، وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ. ﴾ (نور: ۱۸)

ترجمہ: اور اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کی وضاحت کرتا ہے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے۔

اس کا صاف وصریح مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ چونکہ صاحب علم اور صاحب حکمت ہے اس لئے اللہ کے بیان کردہ احکام میں ''بے علمی'' اور ''غیر دانش مندی'' کی کوئی بات یا اس کا شائبہ تک نہیں ہوسکتا۔ بالکل اسی انداز میں بطور تاکید مزید دو جگہوں پر ﴿عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ﴾ کے الفاظ استعمال کرنے کے بعد چوتھے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیَاتِ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ. ﴾ (نور: ۶۱)

ترجمہ: اللہ اسی طرح تمہارے لئے (اپنے) احکام کی وضاحت کرتا ہے تا کہ تم (ان کی حکمتوں) کو سمجھ سکو۔

اب سوال یہ ہے کہ علمائے کرام نے قرآن کی ان آیتوں کو پڑھا ہے کہ نہیں؟ اگر پڑھا ہے تو کیا کبھی سنجیدگی کے ساتھ خدائی علم وحکمت کو سمجھنے کی کوشش اور عملی جدوجہد بھی کی ہے؟ باریٔ

تعالی بار بار عقل، تفکر اور تذکّر پر اُبھارتے ہوئے اہل اسلام کو جھنجوڑ رہا ہے کہ وہ ہر دور میں احکام الٰہی کی معقولیت کا پتہ لگائیں تا کہ قانون الٰہی پر کبھی آنچ نہ آئے اور اُس پر جمود، بے عقلی اور بنیاد پرستی وغیرہ کا الزام کبھی عائد نہ ہو سکے۔ مگر افسوس ہے کہ اہل اسلام اس میدان میں کھرے نہیں اُترے، جس کی وجہ سے آج وہ نہ صرف خود ذلیل ہو رہے ہیں بلکہ دین الٰہی کی بھی ذلت و رسوائی کا باعث بن گئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں قرآن عظیم کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا وہ مستحق ہے۔ بلکہ اس کی تعلیم دیگر علوم کے مقابلے میں نہایت درجہ سرسری انداز میں ہوتی ہے، جس کے باعث وہ نتائج نہیں نکل رہے ہیں جو واقعتاً نکلنے چاہئے تھے۔

تفقّہ فی الدین کیا ہے؟

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ دینی و شرعی مسائل میں عقل و رائے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جب کہ یہ بات مذکورۂ بالا خدائی تصریحات و تعلیمات کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تعقّل و تفکّر کے باعث ''تذکّر'' یعنی تنبّہ حاصل ہوتا ہے جو ''حکمت الٰہی'' کی طرف رہنمائی کرتا ہے جب کہ اس طرز فکر کے باعث دینی احکام و مسائل میں جو بصیرت حاصل ہوتی ہے اُسی کا نام ''تفقّہ فی الدین'' یعنی دین کی سمجھ حاصل کرنا ہے، جس کا تذکرہ حسب ذیل آیت کریمہ میں کیا گیا ہے:

﴿ فَلَوْلاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. ﴾ (توبه: ۱۲۲)

ترجمہ: تو کیوں نہیں نکلی ہر فرقے میں سے ایک جماعت تا کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرتی اور پھر وہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ڈراتی، تا کہ وہ (قوم کے لوگ گناہوں سے) بچتے۔

اسی لئے دوسرے مواقع پر ارشاد ہے:

﴿ أُنْظُرُوْا كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآ يَاتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ. ﴾ (انعام: ۶۵)

ترجمہ: دیکھو ہم کس طرح مختلف طریقوں سے دلائل بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔

﴿فَمَا لِهٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا.﴾ (نساء: ۷۸)

ترجمہ: تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو کوئی بات سمجھ نہیں پا رہے ہیں؟

یہ ہے تفقّہ فی الدین کی حقیقت واصلیت جو دینی احکام و مسائل میں غور و فکر کر کے اسلامی شریعت کے عقلی محاسن کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ.﴾ (آل عمران: ۱۰۳)

ترجمہ: اللہ اسی طرح (اپنے) احکام تمہارے لئے واضح کرتا ہے، تاکہ تم (اللہ کے علم و حکمت کی طرف) راہ یاب ہو سکو۔

اسی لئے اس آیت کریمہ کے فوراً بعد حسب ذیل دو آیتیں مذکور ہیں:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَاُوْلٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ، وَاُوْلٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.﴾ (آل عمران: ۱۰۴-۱۰۵)

ترجمہ: اور چاہئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت (ضرور) ہو جو (لوگوں کو) خیر کی طرف بلائے اور انہیں معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (مگر) تم اُن لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جنہوں نے باہم تفرقہ پیدا کیا اور اختلاف کیا جب کہ اُن کے پاس (ہمارے) واضح دلائل آ چکے تھے، تو ایسے لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا عذاب ہے۔

دیکھئے اس موقع پر سورۂ توبہ والی آیت اور ان آیات میں کس قدر مناسبت موجود ہے۔ ان آیات کی رُو سے حسب ذیل مسائل کا استنباط ہوتا ہے:

۱- ہر فرقہ یا ہر قوم میں سمجھ دار لوگوں (فقہائے دین) کی ایک جماعت ضرور ہونی چاہئے۔

۲- اور ایسے سمجھ دار لوگ جو دین کا صحیح فہم رکھنے والے ہوں وہ اپنی قوم میں واپس آ کر دین کی صحیح تبلیغ کرتے ہوئے افراد قوم کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والے ہوں۔

۳- قوم کو ڈرانے کا مطلب یہ ہے کہ اُسے معروف (یعنی دین و اخلاق کی صحیح بات) کی تلقین کرتے ہوئے منکر (غیر شرعی و غیر اخلاقی) بات سے روکنے والی ہو۔ یعنی معاشرہ میں پھیلی ہوئی غیر شرعی رُسوم و رواج اور بدعتوں کو دور کرے۔

۴- اسلامی معاشرہ میں اختلاف و افتراق پیدا کر کے کسی قسم کا فتنہ یا انتشار برپا نہ کرے، ورنہ ایسے لوگ ایک بہت بڑے عذاب کے مستحق بن جائیں گے۔

دو قسم کی اصلاحی جماعتیں

یہ احکام مسلم معاشرے کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جب کہ پوری اُمت مجموعی اعتبار سے نوع انسانی کی ہدایت اور اُس کی بھلائی کے لئے مبعوث کی گئی ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. ﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: تم بہترین اُمت ہو، جو (تمام) لوگوں کے لئے بھیجے گئے ہو (کیونکہ) تم لوگوں کو معروف کا حکم کرتے اور انہیں منکر سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

دیکھئے آل عمران کی مذکورۂ بالا آیت اور اس آیت میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پچھلی آیت ایک ''قومی'' نوعیت کی تھی، جب کہ یہ آیت کریمہ ''بین الاقوامی'' نوعیت کی ہے۔ کیونکہ اس موقع

پر ایک تو "مِنْکُمْ" کی قید نہیں ہے اور پھر پوری اُمت کو نوع انسانی کی ہدایت کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہر قوم میں ایک "اصلاحی جماعت" ہونے کے علاوہ نوع انسانی کی اصلاح کے لئے ایک "مرکزی جماعت" بھی ضرور ہونی چاہئے۔ لہذا قومی جماعت پیدا کرنا ہر قوم کے ذمہ ایک فرض کفایہ ہے اور مرکزی جماعت کی تشکیل پوری اُمت کے ذمہ واجب ہے، جو ہر دور کے تعلق سے تمام علوم وفنون سے لیس ہو کر دین الٰہی کی مدافعت میں علم وحجت اور دلیل واستدلال کا بازار گرم کر کے بگڑے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لائے۔ ظاہر ہے کہ یہ قرآن حکیم کے صریح احکام ہیں، جن میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

لیکن اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ اُمت سے خطاب کرنے اور غیر اُمت سے خطاب کرنے میں کافی فرق ہے۔ کیونکہ "**کلموا الناس علی قدر عقولهم**" یعنی لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق گفتگو کرو کے حکیمانہ اُصول کے مطابق نوع انسانی سے خطاب خالص علمی وعقلی دلائل کی روشنی میں ہونا ضروری ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں طبقوں کے لئے معروف ومنکر کا پیمانہ بدل جائے گا۔ اس کی تفصیل میں نے اپنی متعدد کتابوں میں کی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے علماء آج ان خدائی ضوابط کے مطابق کام کر رہے ہیں؟ اور کیا ہمارے مدرسے اس قسم کے علماء (دین کی صحیح سمجھ رکھنے والوں) کو تیار کر رہے ہیں؟ نیز یہ کہ کیا نوع انسانی کی اصلاح ورہنمائی کے لئے کوئی جماعت سرگرم عمل ہے؟ اس کے برعکس ہمیں نظر آ رہا ہے کہ آج منبر ومحراب سے اکثر بجائے اصلاح اُمت کے افتراق اُمت کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں اور باہم تفرقہ بازی کا بازار گرم کر کے ایک دوسرے پر گمراہی بلکہ کفر تک کے فتوے صادر کئے جا رہے ہیں۔ کیا یہی تفقہ فی الدین ہے؟ کیا اسی کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے؟ اللہ نے جس کام کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ تو نہیں کیا جا رہا ہے اور جس سے منع کیا گیا ہے

اُسی کو زور وشور کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ کی وعید کیا ہے؟ ''**عذاب عظیم**''۔ یعنی ایک بہت بڑا عذاب ایسے لوگوں کے انتظار میں ہے۔ لہذا اب ایسے تمام لوگوں کو فوراً تائب ہو کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے آمادۂ عمل ہو جانا چاہئے۔ ورنہ عذاب الٰہی سے کسی بھی طرح بچ نہیں سکتے۔

لیکن اس موقع پر ایک اہم ترین سوال یہ ہے کہ آج کل کے علماء میں یہ ذہنیت عمومی اعتبار سے کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ تو اس ناچیز راقم کی نظر میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عربی مدارس میں آج کل جو نظام تعلیم رائج ہے اُس میں فقہی اختلافات کو غیر معمولی اہمیت دے دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے فارغین کے ذہنوں میں شروع ہی سے یہ بات جڑ پکڑ لیتی ہے کہ دین کی اصل فقہی اختلاف ہے۔ بس وہ ان اختلافات کو رٹ لے کر اُمت کے درمیان افتراق پیدا کرنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ فقہی اختلافات صرف بحث ومباحثے کی غرض سے ہیں۔ جن میں غُلو نہیں کرنا چاہئے۔ یہ اختلاف تو صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین میں بھی پایا جاتا تھا، جو خیر القرون ہے۔ مگر اُس دور میں کسی نے ایک دوسرے کو گمراہ نہیں کہا۔

فقہی اختلافات میں مبالغہ آرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء میں عموماً تفقّہ فی الدین کی صلاحیت جاتی رہی اور وہ اس میدان میں پیچھے ہو گئے۔ حالانکہ علماء کا اصل میدان یہی تھا اور ہے۔ اس کا منفی نتیجہ یہ نکلا کہ علماء اصلاح امت اور اصلاح بنی آدم کے میدان میں فیل ہو گئے۔ لہذا اس ناچیز کی ارباب مدارس سے مؤدبانہ طور پر گزارش ہے کہ وہ اب فقہی اختلافات پر زور دینے کے بجائے تفقّہ فی الدین پر زور دیتے ہوئے اپنی ساری صلاحیتیں اس میں جھونک دیں۔ ورنہ نہ تو اُمت کی اصلاح ہوگی اور نہ عالم انسانی ہی کو ہدایت ملے گی۔ بلکہ دونوں جہانوں میں ہماری ذلت ورسوائی ہو کر رہے گی۔

لہٰذا اب اربابِ مدرسہ پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان دو قسم کی جماعتوں کی تیاری پر اپنی پوری توجہ صرف کرتے ہوئے اس کام کو سرفہرست رکھیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہندستان کے ہر بڑے مدرسے میں قدیم و جدید علوم پر مشتمل ایک خصوصی شعبہ ہونا چاہئے، جس میں چند باصلاحیت طلبہ کو دینی و دنیوی دونوں علوم سے آراستہ کر کے ان کی خصوصی طور پر تربیت کی جائے، تاکہ وہ اصلاحِ اُمت اور اصلاحِ بنی آدم کا شرعی فریضہ بخوبی انجام دے سکیں۔ ورنہ ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اور اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ عربی مدارس میں ہر ''ایرے غیرے'' کو داخلہ دے کر طلبہ کی تعداد خواہ مخواہ بڑھانے اور ان کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ''فارغ'' کرا دینے کی فکر چھوڑ کر کردار و کیرکٹر کی بنیاد پر اچھے اور صالح طبیعت کے لڑکوں کو منتخب کرنا چاہئے۔ ورنہ ہماری ملت کا کوئی بھلا نہیں ہوگا۔ تیسری بات یہ ہے کہ جدید علوم اور خاص کر سائنس کو مبادیات کی حد تک ہر طالب علم کو ضرور آگاہ کیا جائے، کیونکہ جدید علوم میں یہ سب سے زیادہ ضروری علم ہے۔ چوتھی بات یہ ہے کہ عربی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کے لئے ایک مشترکہ ٹریننگ کالج ہونا ضروری ہے، جس میں درس و تدریس کی صحیح تربیت دی جاتی ہو۔ ان اقدامات کے ذریعہ انشاء اللہ وہ تمام خطرات بھی دور ہو جائیں گے جو آج عربی مدارس پر ایک تلوار کی طرح لٹک رہے ہیں۔

شریعت پر تحقیقی کام کی نوعیت

بہرحال ان اقدامات کے ذریعہ اُمت میں بیداری کا ایک نیا دور آئے گا اور وہ تمام خرابیاں رفتہ رفتہ دور ہوتی جائیں گی جو آج پائی جا رہی ہیں۔ واضح رہے آج اسلامی شریعت پر تحقیقی کام کرنے اور اس کے عقلی محاسن و مصالح کو واضح کرنے کے لئے بہت سے علوم سے مدد لینا ضروری ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے سائنسی علوم و معارف سے آگاہی کے ساتھ ساتھ

عمرانیات (سوشیالوجی) اقوام عالم کے عائلی ومعاشرتی ضوابط جن میں خصوصیت کے ساتھ یہود ونصاریٰ کی تاریخ اور ان کے عائلی قوانین کا مطالعہ وجائزہ بھی ضروری ہے۔ ان تمام قوانین وضوابط کا موازنہ ومقابلہ جب اسلامی قوانین سے کیا جائے تو اسلامی شریعت کی خوبیاں اور ان کے محاسن سامنے آتے ہیں۔

ہمارے قدیم علماء نے اس سلسلے میں جو ذخیرہ چھوڑا ہے اُسے بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں امام غزالیؒ کی احیاء العلوم، امام رازیؒ کی تفسیر کبیر اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغۃ بھی کام کی چیزیں ہیں۔ مگر مؤخرالذکر کتاب بہت دقیق مباحث پر مشتمل ہے، جسے شاید ہی اب تک کسی نے سمجھا ہو۔ اس سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بھی ایک کتاب ''اسلام اور مصالح عقلیہ'' کے نام سے موجود ہے، جس میں دینی احکام کے بعض مصلحتوں کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ مگر یہ کام جدید اُسلوب اور جدید حقائق ومعارف کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ اور ایسی کتابیں خاص کر موجودہ عقل پرست طبقوں کو قائل کرانے کی غرض سے ہونا چاہیے۔ کیونکہ آج اسلامی شریعت کو ایک دقیانوسی قانون قرار دے کے اس پر مختلف طریقوں سے چاند ماری کی جارہی ہے۔ مگر یہی وہ کام ہے جسے آج علمائے اسلام نے پوری طرح نظرانداز کر دیا ہے۔ اور اس کی اہمیت وافادیت کا کسی کو احساس تک نہیں ہو رہا ہے۔ لہذا اب مسلم پرسنل لاء بورڈ کو فوراً نوٹس لیتے ہوئے اس سلسلے میں بنیادی اقدامات کرنے چاہئیں۔ اور یہ وقت کی پکار ہے۔ لیکن اگر ہماری بے حسی کا یہی عالم رہا تو پھر ہمارے آخری زوال وانحطاط کو دنیا کی کوئی بھی چیز روک نہیں سکتی۔

اکیڈمی کا ایک ہنگامی دور

الغرض اکیڈمی جب شہر کے مرکزی مسلم علاقے میں منتقل ہوئی تو میری ذمہ داریاں

بہت بڑھ گئیں۔ چونکہ یہ ایک پبلک مقام تھا اس لئے مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا۔ اس دوران ادارہ کا اسٹاف بھی بہت بڑھ گیا، جن میں سے بعض تصنیفی ٹریننگ کی غرض سے تھے۔ اور یہ دور ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک جاری رہا جو مختلف قسم کے ہنگاموں سے بھرپور رہا۔ اسی وقفے میں ''قرآن اور سائنس'' کے موضوع پر تحقیقی خطبات کا بھی سلسلہ جاری ہوا، جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔ اور اسی دوران ''زکاۃ کے اجتماعی نظام'' کے موضوع پر ایک سیمنار بھی منعقد کر دیا جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

مگر ان گونا گوں قسم کے ہنگاموں کے باوجود بندہ تحقیقی میدان میں کسی بھی طرف نچلا نہیں بیٹھ سکا۔ بلکہ اپنی اُفتادِ طبع کے مطابق مختلف موضوعات پر کام شروع کر دیا۔ ذہن میں مختلف قسم کے مسائل کا ایک ہجوم ٹھاٹ مارتے ہوئے سمندر کی طرح موجزن رہتا تھا۔ اور یہ سوتے بیٹھتے اُٹھتے جاگتے ہر وقت یکے بعد دیگرے میرے ذہن و دماغ کے گوشوں میں چکر کاٹتے رہتے تھے۔ اس طرح میرے ذہن و دماغ میں سیکڑوں قسم کے مسائل کی ایک ''پریڈ'' ہمیشہ جاری رہتی تھی۔ اور میں ذہن ہی ذہن میں ان گونا گوں مسائل کے تانے بانے بنتا رہتا تھا۔ جب بھی کسی مسئلے کا حل ذہن میں آ جاتا، چاہے وہ شرعی یا فقہی ہو یا فکری و کلامی، اُسے قلمبند کرنے بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اس طرح کئی کئی مسائل پر بیک وقت کام ہوتا رہتا تھا۔ اس طرح میرا دماغ ایک کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ اور میں ہر مسئلے کو سب سے پہلے قرآن اور حدیث کی روشنی میں جانچنے کا عادی تھا، خواہ علماء و فقہاء کا نقطۂ نظر اس سلسلے میں کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ پھر اس کے بعد میں علماء اور مفسرین کے اقوال پر نظر ڈالتے ہوئے دیکھتا کہ اُنہوں نے کیا کہا ہے؟ اور مجھے خوشی ہوتی کہ اکثر و بیشتر مجھے اپنی تائید کے لئے دلائل مل جاتے۔ اس طرح بغیر کسی ''بندش'' کے میں ہمیشہ آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے کا عادی رہا۔ لیکن اس کے باوجود مجھے ''سلف صالحین'' پر تنقید و تعریض کرنا کبھی

گوارا نہیں ہوا۔ کیونکہ ہر زمانے کا ایک عقلی مزاج ہوتا ہے، جس کو نظرانداز کر کے کوئی بھی تفسیر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح میں نے سابقہ مفسرین پر تنقید کرنے کے بجائے اکثر و بیشتر اُن کی جانب سے مدافعت کی ہے۔

میری بعض ادھوری تحقیقات

ا- غرض ہر نئے مسئلے میں جب تک اجتہادی نقطۂ نظر سے غور نہ کیا جائے کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ تقلیدی ذہنیت کے باعث مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور زیادہ اُلجھ جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں نئے نئے حقائق و معارف کا انکار تک کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔ چنانچہ فلکیاتی نقطۂ نظر سے رُؤیت ہلال کا مسئلہ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ علمائے اسلام جدید علوم و مسائل سے چونکہ بالکل ناواقف ہیں اس لئے وہ کسی بھی علمی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار دکھائی نہیں دیتے۔ اس بنا پر ہندستان میں تقریباً ہر سال عیدالفطر کے موقع پر عجیب وغریب قسم کے تماشے ہی نہیں بلکہ سر پھٹول تک دکھائی دیتا ہے۔ اور ملک کے مختلف مقامات میں عیدالفطر دو دو بلکہ کبھی کبھی تین تین دن منائی جاتی ہے۔

لہٰذا بندہ اس موضوع پر سالہا سال تک غور و فکر کرتا رہا۔ پھر میں نے ذخیرۂ احادیث میں اس مشکل اور نازک ترین مسئلے کا حل ڈھونڈھ ہی لیا۔ اور ایک لمبی اور مفصل بحث لکھنی شروع کر دی۔ مگر میری ہنگامی زندگی کے باعث اسے مکمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مگر میں نے اپنے نتائج فکر یہ کا خلاصہ ''رؤیت ہلال کے لئے فلکیاتی حساب معتبر ہے یا نہیں؟'' کے عنوان سے ۱۹۹۹ء میں شائع کر دیا ہے۔

۲- شرعی مسائل میں طلاق اور تعدادِ ازدواج دو نہایت درجہ اہم اور معرکۃ الآراء مسئلے ہیں جو ہندستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں فرقہ پرستوں اور مستشرقین کی تنقید کا سب سے بڑا

ہدف رہے ہیں۔ اوران دو مسائل نے اس اُمت کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ہندستان میں تو فرقہ پرستوں نے متعدد مرتبہ طوفان بدتمیزی کھڑا کردیا ہے۔ چنانچہ یہ فتنہ ۱۹۸۰ء کے دہے میں اپنے شباب پر تھا۔ اُس وقت راقم ان دو مسائل پر خصوصیت کے ساتھ قلم اُٹھایا اور کچھ کتابیں تصنیف کرکے شائع کردیں، جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ میں نے یہ کتابیں فرقہ پرستوں کے جواب میں لکھی تھیں۔ مگر بعض ''غیر مقلد'' حضرات نے ان کا خواہ مخواہ اور بلاوجہ نوٹس لیا اور خطوط کے ذریعہ اعتراضات کرنا شروع کردیا تو مجھے مجبور ہوکر ایک کتاب ''تین طلاق کا ثبوت اسلامی شریعت میں'' کے عنوان سے قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس چاروں شرعی ماخذوں کا جائزہ لے کر اس مسئلے کے قطعی اور مُسکت دلائل پیش کئے۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

اسلامی شریعت پر میں نے جو تحقیقی کام کیا وہ زیادہ تر متبعین اسلام کی ذہن سازی کے لئے تھا کہ وہ غیروں کے بہکاوے میں آ کر اسلامی شریعت کو شک وشبہ کی نظر سے نہ دیکھیں اور فرقہ پرستوں یا ''متجدّد'' قسم کے ''دانشوروں'' کے بہکاوے میں نہ آئیں۔ لہذا یہ فکر برابر دامنگیر رہی کہ غیر مسلموں کی ذہن سازی کے لئے خالص علمی وعقلی نقطۂ نظر سے بھی ان دو مسائل پر کچھ کام ہونا ضروری ہے۔ اوراس کام کے دو محرکات یہ تھے:

پہلا محرک یہ تھا کہ اکیڈمی کے سامنے ''دار الشریعة: مرکز تحقیقات شرعیہ'' کا باوقار سائن بورڈ نصب تھا۔ اس لئے شرعی مسائل پر تحقیقی کام کرنا میرے وقار کا سوال بن گیا تھا۔

اور دوسرا محرک یہ تھا کہ ان ہی دنوں بنگلور میں چند مسلم وکلاء نے اسلامی قانون کے دفاع کے لئے ایک مجلس ''اسلامک لاء کونسل'' کے نام سے بنائی جس کا ایک اجلاس فرقانیہ اکیڈمی میں ہوا اور اُنھوں نے مجھے اس کونسل کا چیرمین منتخب کرکے اسلامی قانون کی مدافعت میں کتابیں لکھنے کی دعوت دی۔ ان دو اسباب کی بنا پر جب بھی مجھے اپنے ہنگامی کاموں سے فرصت ملتی ان

مسائل پر غور وفکر میں ڈوب کر کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔ چنانچہ انہی ایام میں ''تین طلاق کی معقولیت اور عصر جدید کی فتنہ انگیزی'' کے عنوان سے ایک وقیع مضمون لکھا جسے ہندستان بھر کے اردو اخبارات نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ نمایاں طور پر شائع کیا اور بعد میں اسے اسلامی لاء کونسل کی جانب سے کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا۔ پھر میں نے ان موضوعات پر مزید دو کتابیں لکھنے کا خاکہ بنایا، جو اس طرح ہیں:

۱- طلاق: اسلام اور عالمی قوانین میں

۲-تعدد ازدواج: علم اور عقل کی کسوٹی پر

مگر کثرت مشاغل کے باعث یہ کام مکمل نہ ہوسکا، بلکہ وہ چند بحثوں سے آگے نہ بڑھ سکا مگر طلاق کی معقولیت پر ایک اور مضمون منظر عام پر آیا، جو بعض اخبارات میں شائع ہوا۔

۳- ''اسلام میں عورت کا درجہ''، اس عنوان کے تحت ایک تحقیقی کتاب لکھنی شروع کی، جس میں پہلا باب جدید ترین سائنسی حقائق کی روشنی میں مرد اور عورت کے جسمانی و نفسیاتی اختلافات کو اُجاگر کر کے ان دونوں میں پائے جانے والے ''عدم مساوات'' کی حقیقت خالص سائنسی نقطۂ نظر سے ثابت کی جاسکے۔ مگر یہ کام بھی چند ابتدائی مباحث سے آگے نہ بڑھ سکا۔

خنزیر حرام کیوں؟

آج کل مغربی ممالک میں ایک منظّم کوشش یہ ہورہی ہے کہ جب بھی کوئی پڑھا لکھا مسلمان وہاں جاتا ہے تو اُس کے ذہن میں اسلام کے تعلق سے چند شکوک وشبہات پیدا کر کے اسے تشکیک میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بمبئی کے ایک تاجر نے مجھ سے ایک مرتبہ سوال کیا کہ مولانا اسلام میں سوّر حرام کیوں ہے؟ پھر اُنہوں نے خود ہی اپنا واقعہ بتایا کہ مجھے اپنی تجارت کے سلسلے میں بارہا یورپ جانے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہاں کے لوگ مجھے مسلمان سمجھ کر پوچھتے ہیں کہ

آپ کے مذہب میں یہ حرام کیوں ہے؟ پھر اُنہوں نے خود ہی کہا کہ میں نے اس کا جواب یہ دیا کیونکہ سور انسانی فضلہ کھاتا ہے۔ اس پر اُن سے کہا گیا کہ مرغی بھی تو انسانی فضلہ کھاتی ہے، لہٰذا وہ حلال کیوں ہے؟ اور پھر اُن سے یہ بھی کہا گیا کہ اب ہم ان جانوروں کو غلاظت کھانے نہیں دیتے بلکہ انہیں ایک کٹہرے میں بند کر کے انجیر کھلاتے ہیں۔ اس پر تاجر صاحب سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ پھر اُنہوں نے کہا کہ میں نے اس سلسلے میں متعدد علماء سے رُجوع کیا مگر کسی نے بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر راقم نے اُن سے وعدہ کیا میں انشاء اللہ اس مسئلے پر غور و خوض کرنے کے بعد کوئی تشفی بخش جواب دوں گا۔

چنانچہ اس کے بعد میں نے پہلے اسلامی لٹریچر کو کھنگالنا شروع کیا کہ شاید کسی عالم یا مفسر نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہو۔ مگر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ بعض جدید عربی تفاسیر میں صرف اس قدر ہے کہ سوّر کے گوشت میں ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے جو صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ بُرا جانور جنسی اعتبار سے بہت زیادہ شہوانیت پسند ہے، جس کا گوشت کھانے سے انسانوں میں بھی شہوانیت پسندی میں تیزی پیدا ہو سکتی ہے۔

اتنا جواب تاجر موصوف کو میں نے لکھ کر بھیج دیا اور اُن سے وعدہ کیا کہ انشاء اللہ مزید تحقیق کے بعد اس سلسلے میں کچھ مزید عرض کر سکوں گا۔ پھر اس کے بعد راقم نے جدید طبی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا تو ایسے ایسے عجیب و غریب حقائق سامنے آئے جو بیان سے باہر ہیں اور انہیں خود مغربی اقوام نے منکشف کئے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس سلسلے میں ''خنزیر کا گوشت: جدید طب وسائنس کی نظر میں'' کے عنوان سے جمع کرنا شروع کر دیا۔ مگر یہ حقائق اب تک صرف چند نوٹس کی شکل میں موجود ہیں۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان مباحث کو علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے سے پہلے انہیں اچھی طرح چھان پھٹک لینا چاہئے۔

اسلام میں زکاۃ کا نظام

پورے برصغیر ہندو پاک ہی نہیں بلکہ غالباً پوری دنیائے اسلام میں یہ اپنی نوعیت کا اولین اور منفرد تحقیقی کام ہے، جس کی ابتداء کرنے کا شرف اس فقیر حقیر کو حاصل ہوا۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

اس لئے مجھے بار بار خیال آتا تھا کہ میں اکیلا تو اس میدان میں زیادہ دن کام نہیں کرسکوں گا، لہذا اس کام کو جاری رکھنے کے لئے چند باصلاحیت افراد کی تربیت ضروری ہے۔ لیکن پھر یہ خیال بھی برابر ستاتا رہا کہ بغیر ذریعہ آمدنی کے اسے کیسے برقرار رکھا جائے۔ اس مسئلے پر میں اکیڈمی کے قیام کے بعد برابر غور کرتا رہا۔ اتفاق سے ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی معرکۃ الآراء کتاب ''فقہ الزکاۃ'' میرے ہاتھ لگی، جس میں ''فی سبیل اللہ'' کے تحت زکاۃ تحقیقی کام کرنے والوں کو دئے جانے کا جواز ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بحث کا اردو ترجمہ ''زکاۃ کا ایک مصرف فی سبیل اللہ'' کے عنوان سے اپنے سہ ماہی رسالے ''ندائے فرقان'' میں شائع کیا۔ پھر اس کے بعد ۱۹۸۷ء میں ایک کتابچہ ''اسلام میں زکاۃ کا نظام'' کے نام سے تحریر کیا جس میں مذکورۂ بالا کتاب کے چند اقتباسات کے علاوہ راقم نے اپنے دلائل بھی پیش کئے۔ اور یہ ایک مضمون کی شکل میں بعض علمی رسائل جیسے ماہنامہ بُرہان دہلی میں بھی شائع ہوا۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ بعض علماء بوکھلا گئے اور اُنھوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا اور اسے ایک ''غیر اسلامی'' تصور قرار دیتے ہوئے مجھ پر سنگین قسم کے الزامات کی بوچھار کردی۔ کیونکہ اُن کی نظر میں زکاۃ کے حقدار صرف اہل مدرسہ تھے۔ حالانکہ یہ بات نہ صرف قرآن اور حدیث کی تصریحات کے خلاف تھی بلکہ خود ائمہ کرام اور فقہاء کے فتاویٰ کے بھی خلاف تھی۔ لہذا راقم کو اس قسم کی نازیبا حرکت پر بہت غصہ آیا تو میں نے ''زکاۃ کے مستحق کون ہیں؟'' کے نام سے تین حصوں میں ایک ضخیم کتاب تحریر کی، اور اس میں قرآن اور حدیث کے نئے نئے دلائل اور فقہاء

وائمہ کرام کے تمام اقوال کو جمع کر کے پوری طرح ثابت کر دیا کہ علمی کاموں کے لئے زکاۃ دینا اسلامی احکام کے عین مطابق ہے۔ اور اس حقیقت کا انکار قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کا انکار ہے۔ چنانچہ میرے وزنی اور ناقابل تردید دلائل کو بعض علماء نے تسلیم کر لیا۔

غرض اس کتاب کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن راقم کو انتہائی افسوس ہے کہ میں جذبات سے مغلوب ہو کر اس میں اہل مدرسہ کے خلاف بعض نازیبا کلمات بھی لکھ دئے ہیں۔ لیکن اگر مجھے ایک بددیانت شخص قرار دے کر بھڑکایا اور للکارا نہ جاتا تو اس کی نوبت کبھی نہ آتی۔ بہرحال زکاۃ کے موضوع پر اب تک حسب ذیل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں:

۱- اسلام میں زکاۃ کا نظام
۲- زکاۃ کے مستحق کون ہیں؟ (دو حصے)
۳- زکاۃ اور مصالح عامہ
۴- کیا زکاۃ علماء کو دی جا سکتی ہے؟
۵- زکاۃ کا اجتماعی نظام
۶- زکاۃ کے آٹھ مصارف اور فی سبیل اللہ کی اہمیت

زکاۃ کے موضوع پر ایک سیمنار

اسلام میں زکاۃ کے اجتماعی نظام کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ قرآن اور حدیث کی بعض تصریحات اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ آج ہماری ملت میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں اور زکاۃ کی رقم سے جو واقعی حقدار محروم ہیں اُس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری ملّت میں زکاۃ کا اجتماعی نظام نافذ نہیں ہے۔ اس وجہ سے ملت کی یہ قیمتی رقم من مانے طور پر صرف ہی نہیں بلکہ درحقیقت ضائع کی جا رہی ہے۔ اسی بنا پر اس ملت میں

اصلاح کی بجائے بگاڑ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر زکاۃ کا صحیح نظام قائم ہو جائے تو ہر حقدار اور ہر مدرسے کو اُس کا حق گھر بیٹھے مل سکتا ہے اور اس اقدام کے نتیجے میں وہ تمام بوگس مدرسے بھی بند ہو جائیں گے جن کا وجود صرف کاغذ پر ہے۔ اسی طرح ہر مدرسے کو اُس کی استعداد کے مطابق رقم بغیر مانگے مل سکتی ہے۔ اور بلا ضرورت جو مدرسے قائم کئے جا رہے ہیں یا جو برائے نام ہیں اُن سب کا سد باب بھی ہو سکتا ہے۔

لہذا اگر زکاۃ کا صحیح نظام قائم ہو جائے تو اس قسم کی تمام بے اعتدالیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور قائدین ملت اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس مقام پر اور کس قسم کے مدرسے کی ضرورت ہے؟ اور پھر وہ ہر ایک کو اُس کی ضرورت کے مطابق زکاۃ کی رقم دے سکتے ہیں۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر ہر ایک کو من مانے طریقے سے زکاۃ وصول کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے تو پھر ملّت کی یہ رقم ضائع ہو جائے گی اور حقداروں کا حق مارا جائے گا۔

اس لئے یہ اصلاح بہت ضروری ہے۔ لیکن اس کی مخالفت سب سے زیادہ خود اہل مدرسہ ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ اُنہیں کسی قسم کی "پابندی" یا ضابطے کے طور پر کام کرنا پسند نہیں ہے۔ بلکہ بعض اہل مدرسہ تو اسلام میں زکاۃ کے اجتماعی نظام کا وجود تک ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ لہذا راقم نے ان تمام وجوہات کی بنا پر "زکاۃ کا اجتماعی نظام" کے موضوع پر ایک آل انڈیا سیمنار منعقد کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ہندستان کے بڑے بڑے علماء کو اس میں شرکت کرنے اور مقالات بھیجنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ناچیز کی اس صدا پر دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنوء، ادارۂ تحقیق و تصنیف علی گڑھ، دار العلوم تاج المساجد بھوپال، دار العلوم سُبل السلام حیدرآباد، اور جامعہ دار السلام عمر آباد وغیرہ کے علماء اور اہل نظر اصحاب نے اس موضوع پر علمی مقالات اور پیغامات بھیجے۔ نیز اس کے علاوہ دیگر اداروں کے علماء نے بھی اپنی رایوں کا اظہار کیا۔ اور ان

سب کی رایوں میں بعض اختلافات کے باوجود ایک بات بالکل واضح اور متفقہ یہ تھی کہ ''زکاۃ کے اجتماعی نظام کی راہ میں شرعی حیثیت سے کوئی رکاوٹ یا بندش نہیں ہے۔ بلکہ ہر ملک کے مسلمان کوئی ادارہ یا تنظیم قائم کر کے یہ کام انجام دے سکتے ہیں''۔

بہر حال یہ سیمینار دار الشریعہ کے زیر اہتمام ۱۲-۱۳ مارچ ۱۹۹۵ء میں بہت شاندار پیمانے پر منعقد ہوا، جس میں وقف دار العلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا سالم صاحب قاسمی اور جناب مولانا حبیب ریحان صاحب ندوی ناظم تعلیمات دار العلوم تاج المساجد بھوپال بنفس نفیس تشریف لائے۔ اس موقع پر راقم نے اپنا کلیدی خطبہ دیا اور اس موضوع پر ایک تحقیقی مقالہ بھی پیش کیا۔ اس سیمینار کی رپورٹ ہندستان کے اردو اخبارات نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ شائع کی۔ اور بعض بیرونی ممالک میں بھی اس کی تشہیر ہوئی۔

اس سیمینار کی پوری رپورٹ مع مقالات و پیغامات مرتب شدہ حالت میں موجود ہے، لیکن بعض موانع کی بناء پر اب تک اسے شائع نہیں کیا جا سکا ہے۔ انشاء اللہ اسے عنقریب شائع کیا جائے گا۔

ملت کی کایا پلٹنے والا ایک نسخہ

زکاۃ کا اجتماعی نظام وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اگر اس پر صحیح معنی میں عمل کیا جائے تو ملت اسلامیہ کی کایا پلٹ سکتی ہے اور اسلامی معاشرے کا سُدھار ہو سکتا ہے۔ اور آج ہماری ملت میں جو خرابیاں پائی جا رہی ہیں اور جہالت و پس ماندگی کی جو نحوست دکھائی دے رہی ہے اُن سب کا سد باب ہو سکتا ہے کیونکہ اسلام میں زکاۃ کے جو آٹھ مصارف ہیں (دیکھئے سورۂ توبہ آیت نمبر ۶۰) ان میں اتنی وسعت موجود ہے جو پورے اسلامی معاشرے کے سُدھار کے لئے بہت کافی ہے۔ اور یہ ''آٹھ نکاتی'' منصوبہ اسلام کے ایک مکمل اور ہمہ گیر نظام کی ترجمانی

کرتا ہے، جو اسلام کے نظام اقتصادیات کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ منصوبہ ہر مسلم قوم اور ہر مسلم معاشرے میں قائم ہوسکتا ہے، خواہ وہاں کی حکومت مسلم ہو یا غیر مسلم۔ مگر آج کل کے مسلمان اپنی جہالت و ناواقفیت کی وجہ سے اس ربانی ''منشور'' پر عمل کر کے اپنی قوم و معاشرے کا سُدھار کرنے سے قاصر اور ناکام نظر آ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے قوم کی یہ قیمتی رقم ہر سال کروڑوں کی تعداد میں یا تو ''ضائع'' ہو رہی ہے یا بعض لوگ جی بھر کر اس کا ''استحصال'' کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی اس جہالت کے باعث خدائے علیم و خبیر کا یہ ''نسخہ ءکیمیا'' دھرا کا دھرا ہی رہ گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے نظام کی مخالفت خود اسلام ہی کے بعض ٹھیکیدار کرتے ہیں، جو قوم و ملّت کا سُدھار کرنے کے بجائے خود اپنے ''سُدھار'' کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اگر میں اس اجمال کی تفصیل کرنے بیٹھ جاؤں تو شاید مجھے ایک اور کتاب لکھنی پڑے گی۔ کیونکہ اس سلسلے میں اتنے تلخ اور ننگے حقائق موجود ہیں، جن کی تفصیل سے علمی دنیا میں ایک بھونچال آ سکتا ہے۔

عمائدینِ ملّت سے صاف صاف باتیں

آج ملّت اسلامیہ کا جو حال زار ہے اور وہ جس پستی میں جا گری ہے وہ نہایت درجہ افسوسناک ہے۔ آج مسلم معاشرہ ایک عجیب وغریب صورت حال سے دوچار ہے، جس کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے۔ مسلم معاشرہ میں پس ماندگی اور جہالت ایک عام بات ہے۔ نہ دینی تعلیم ہے اور نہ دنیوی تعلیم، سوائے چند گنے چنے افراد کے۔ آج ہندستان میں غیر مسلموں کی چھوٹی چھوٹی اور پس ماندہ قومیں تک ترقی کے بام عروج پر نظر آ رہی ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں مسلم معاشرہ اچھوتوں سے بھی بدتر نظر آ رہا ہے۔ تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ زکاۃ کی وہ کروڑوں کی رقم کہاں جا رہی ہے اور اس سے قوم کا بھلا کیوں نہیں ہوتا؟ زکاۃ کی رقم دراصل اسلام اور اسلامی معاشرہ کے بازو مضبوط بنانے کی غرض سے ہے، نہ کہ اسے بھکاریوں اور ''ان دیکھے'' اداروں پر

''بے تحاشہ'' لُٹانے کی غرض سے۔ راقم نے ان مسائل پر اپنی کتابوں میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ لہذا اس موقع پر صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جب تک عمائدین ملت بیدار ہوکر زکاۃ کے اجتماعی نظام کے لئے جدوجہد نہیں کرتے اس ملت کا کوئی بھلا ہونے والا نہیں۔ اسلام میں زکاۃ کے اجتماعی نظام کی پوری پوری اجازت ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ملک کے ہر ہر صوبے اور ہر ہر شہر میں کچھ مخلص اور صالح افراد اس کام کے لئے کمر بستہ ہو جائیں اور اس ملّت کو سکرات کے عالم سے باہر نکالیں۔ ورنہ یہ ''خیر اُمت'' ایک بدترین اُمت بن کر رہ جائے گی، جو ایک سڑی ہوئی لاش کی طرح ہوگی۔

اس سلسلے میں عمائدین ملت سے دوسری گزارش یہ ہے کہ وہ اجتماعی طور پر زکاۃ کی تقسیم کے لئے اپنے شہروں میں مسلم معاشرہ کا ایک سروے کرائیں اور ایک جامع فہرست تیار کر کے ہر مستحق شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق رقم دیں۔ اور خاص کر دینی و دنیوی ہر قسم کی تعلیم کے لئے مستحق لوگوں کے لئے وظائف یا اسکالرشپ جاری کریں۔ اور کسی بھی مدرسہ اور کسی بھی ادارے کی مدد کرنے سے پہلے اُس کے بارے میں پوری طرح چھان بین کرلیں، تاکہ زکاۃ کی قیمتی رقم کسی بھی طرح ضائع نہ ہونے پائے۔

اس قسم کے اقدامات کے ذریعہ ملت میں اصلاح اور سُدھار کا ایک نیا دور آئے گا جو ملت کی کایا پلٹ دے گا۔ لہذا اس سلسلے میں بہی خواہان ملت کو فوراً متنبّہ ہوکر اصلاح اُمت کے لئے کمر بستہ ہو جانا چاہئے۔ تباہی تو ہماری بہت ہو چکی ہے مگر آنے والی تباہی اس سے زیادہ المناک ہو سکتی ہے۔

ارباب مدرسہ سے صاف صاف باتیں

بندہ اس وقت چراغ سحری ہے اور پتہ نہیں کہ زندگی کا دیا کب بجھ جائے۔ لہذا اس

وقت اربابِ مدرسہ سے چند صاف صاف باتیں مخلصانہ طور پر اور بغرض اصلاح عرض کر دینا چاہتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ بطور ''مسابقت'' طلبہ کی تعداد خواہ مخواہ بڑھانے اور ناکارہ قسم کے لڑکوں کو داخلہ دے کر علم دین کا وقار مجروح کرنے کے بجائے قابل اور ہونہار قسم کے لڑکوں کو داخلہ دیا جائے اور داخلے سے پہلے اُن کے چلن کا پتہ لگانے کی بھی پوری کوشش کر لیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی علوم میں قرآن حکیم کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جائے اور مختلف علوم وفنون کی روشنی میں اُس کے حقائق ومعارف کو واضح کر کے اُس کی تعلیم کا حق ادا کریں۔ بہتر بات یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کی تعلیم محض فقہی اختلافات کی حیثیت سے نہیں بلکہ ''فقه القرآن'' اور ''فقه الحديث'' کے نقطۂ نظر سے ہو۔ کیونکہ قرآن ہی کی طرح حدیث کے معارف کی بھی انتہاء نہیں ہے۔ اس طرح جو علم حاصل ہوگا وہی ''تفقه فی الدین'' کہلائے گا۔ کیونکہ قرآن اور حدیث شریعت کے دو ابدی ودائمی مراجع ہیں جن میں مستقبل کے تعلق سے ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور وہ تفقہ کے بغیر محض سرسری مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فقہی اختلافات میں غلو کی وجہ سے یہ چیز دب کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ یہی چیز دین کی اصل ہے، جس میں دین کی اصلی روح پائی جاتی ہے۔ اگر تفقہ کی یہ روح نہ پائی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اجتہادی مسائل کو محض ''ووٹنگ'' کے ذریعہ پاس کرانے کی نوبت آجائے گی، جیسا کہ آج کل یہ تماشہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتہاد نہیں بلکہ اجتہاد کے نام پر ایک بھونڈا سا مذاق ہے۔ لہٰذا اب اس قسم کے تماشے بند کر کے اہل بصیرت علماء (جن کو صحیح معنی میں فقہاء کہا جا سکے) کو پیدا کرنے پر زور دینا چاہئے۔ ورنہ اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تفقّه فی الدین کی بدولت وہ اجتہادی ملکہ پیدا ہوتا ہے، جس کے باعث ہر دور میں جدید علوم کے چیلنجوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر عصری چیلنجوں کا مقابلہ

کرنے کے لئے ہمیشہ عصری علوم ومسائل کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ جب کسی کو تفقہ فی الدین حاصل ہو جائے تو وہ دین متین کے ابدی ''نصوص'' (قرآن اور حدیث کی واضح تصریحات) کی روشنی میں ہر قسم کے فکری ونظریاتی اور شرعی وفقہی چیلنجوں کا مقابلہ اجتہادی طور پر کر کے زمانے کی کلائیاں موڑ سکتا ہے۔

اور چوتھی بات یہ ہے کہ جدید علوم وفنون کی اہمیت کو کسی بھی طرح نظر انداز نہ کیا جائے۔ کیونکہ ہر دور میں دین الٰہی کا تعلق اس دور کے ''عصری علوم'' سے بہت گہرا رہا ہے۔ اسی لئے ہر دور میں انبیائے کرام کو جو بھی معجزے دئے گئے تھے وہ متعلقہ دور کے علوم وفنون کے تقاضوں کے عین مطابق تھے۔ اس اعتبار سے دین الٰہی کا اعجاز ہمیشہ عصری علوم وفنون سے بہت گہرا رہا ہے۔ لہٰذا جو قوم یا ملت عصری علوم کو نظر انداز کر دے وہ نہ صرف زندگی کے میدان میں مار کھائے گی بلکہ دین الٰہی کو بھی رسوا کرے گی۔

مگر یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر طالب علم یا ہر عالم تمام اسلامی اور جدید علوم پر حاوی ہو جائے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ ہر طالب علم کو کم از کم درجے میں سائنسی علوم کی ''شُد بُد'' ضرور ہونی چاہئے۔ ہاں البتہ ہر بڑے مدرسے میں ایک خصوصی جماعت ایسی تیار کرنا شرعاً واجب ہے جو تمام اسلامی اور تمام عصری علوم وفنون پر حاوی ہو۔ تاکہ ملت جب بھی کسی نئے مسئلے سے دوچار ہو تو وہ اسے اجتہادی طور پر حل کر کے ملت کی بروقت رہنمائی کر سکے۔ تاکہ افراد ملت پر کسی قسم کی بوکھلاہٹ طاری نہ ہو اور وہ کسی قسم کے فکری انتشار میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ یا وہ کسی بھی علمی حقیقت کا انکار کر کے ہونّقوں کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے نہ لگ جائیں۔

اگر ارباب مدرسہ اس قسم کی کوئی جماعت پیدا کرنے سے قاصر ہیں تو للہ وہ اس ملت پر رحم کر کے اپنے مدرسے بند کر دیں، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کو ایسی ناکارہ تعلیم گاہوں کی کوئی

ضرورت نہیں ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کی صحیح خدمت کرنے کے بجائے محض ''فقہی اختلافات'' کو اُچھال کر ملت کو باہم لڑانے اور اسے اندر سے کمزور کردینے والی ہوں۔ اور ایسے مدرسے پانی کے اُس جھاگ کی طرح ہیں جس میں ''خیر'' کی کوئی علامت نہیں ہوتی:

﴿ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً، وَأَمَّا مَايَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِيْ الْأَرْضِ. ﴾

(رعد: ۷)

ترجمہ: جو جھاگ ہے وہ بیکار چلا جاتا ہے اور جو چیز لوگوں کے لئے نفع بخش ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔

غرض جو چیز بے فائدہ اور اُمت کے لئے غیر نافع ہو اُسے جتنی جلد ہوسکے رخصت ہوجانا چاہیئے۔ کیونکہ اس جمود و تعطل کے باعث اسلام کی ابدیت پر حرف آتا ہے اور لوگوں کی نظروں میں وہ ایک مُردہ مذہب قرار پاتا ہے۔ اور مسلمان ایک ناکارہ بلکہ نکمی قوم قرار پاتے ہیں۔

اسی طرح آج کل مدرسوں کا ایک سیلاب سا نظر آرہا ہے جس کی بنا پر امت کے مسائل کا حل نکلنے کے بجائے اس میں اضافہ ہورہا ہے۔ کیونکہ آج کل یہ سلسلہ ''اقتصادی مسئلہ'' سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ یعنی مدرسے سے فارغ ہونے والا ہر شخص محض اپنا مسئلہ حل کرنے کی غرض سے ایک نیا مدرسہ کھولنے کے چکر میں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ملت کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ اپنی ناکارگی کی ایک علامت ہے۔ جو لوگ اپنا ''حق'' قوم سے وصول کرتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ وہ قوم کا ''حق'' بھی پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کریں۔ اس طرح آج مدارس کا ایک وسیع ''آپریشن'' بہت ضروری ہے، تاکہ اس میں جو ناکارہ مواد ہے وہ پوری طرح خارج ہوجائے اور جو مفید چیز ہے وہ برقرار رہے۔ واضح رہے بندہ یہ سب باتیں کسی وقتی جوش وجذبے کے تحت نہیں بلکہ اصلاح ملت کی غرض سے تحریر کررہا ہے۔

راقم کا یہ صرف نظریہ ہی نہیں بلکہ پکا اعتقاد بھی ہے کہ جس دن عربی مدارس کی اصلاح ہوگی وہی دن اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا پہلا دن ہوگا۔ اور پھر اہل اسلام کی گاڑی پٹری پر آ جائے گی اور وہ اپنی پوری رفتار سے دوڑنے لگے گی۔ اسلام چونکہ ساری دنیا کی ہدایت کے لئے آیا ہے لہذا اس ملت کو پوری انسانیت کے لئے کام کرنا اور اس کی تیاری کرنا چاہئے۔ اگر ہم آپس ہی میں لڑتے اور اپنی توانائی ضائع کرتے رہے تو پھر اپنے دشمنوں سے کس طرح لڑسکیں گے۔ باہمی سر پھٹول بہت ہو چکا۔ لہذا اب اس دنگل کو ہمیشہ کے لئے بند کر دینا چاہئے، جس میں نہ تو دین کا کوئی فائدہ ہے اور نہ دنیا کا، بلکہ اس سے سوائے جگ ہنسائی کے اور کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

زکاۃ کا ناقص نظام اور اس کے ہولناک نتائج

اس وقت ہماری ملت جن مسائل و مشکلات سے دوچار ہے وہ صرف فکری و نظریاتی ہی نہیں بلکہ ان میں اجتماعی مسائل و مشکلات بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ ہندستان میں ایک مرکزی دینی قیادت کا ہے، جس کے فُقدان کی بنا پر آج اُمت مُسلمہ منتشر و پراگندہ بھیڑوں کی طرح بن کر رہ گئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں قومی و بین الاقوامی سطح پر اس کا وقار ہمیشہ مجروح ہوتا رہا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی کے ایسے بے شمار مسائل ہیں جن میں صحیح رہنمائی کے لئے ایک ایک دینی قیادت وسیادت کی ہر دور میں ضرورت رہی ہے، جیسے تعلیمی مسائل، معاشرتی وسماجی مسائل، معاشی مسائل اور تہذیبی مسائل وغیرہ۔

مگر ہمارے ''دینی قائدین'' آج ان میں سے کوئی بھی مسئلہ حل کرنے میں پوری طرح ناکام ہو چکے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آج دینی مدارس میں باہمی طور پر کوئی ربط وتعلق نہیں ہے۔ بلکہ ہر مدرسہ ایک ''آزاد'' اور خود مختار ادارہ بن چکا ہے اور وہ اپنے آپ کو اپنے

علاقے کا ''بادشاہ'' تصور کرتا ہے، اور اس کے اس علاقے میں کسی کی ''مداخلت'' کو وہ برداشت نہیں کرتا۔ آپ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ آج ہندستان میں جتنے بھی مدرسے ہیں تقریباً سب کا یہی حال نظر آئے گا۔ اسی لئے کوئی کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی وجہ جس کی وجہ سے آج پوری اُمت منتشر و پراگندہ نظر آ رہی ہے اور کوئی قیادت اُبھرنے نہیں پا رہی ہے۔ کیونکہ کوئی کسی کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہے، سوائے وقتی طور پر ''ہاں ہاں'' کہہ دینے کے۔

اس فقیر حقیر پُر تقصیر نے اس مسئلے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا تو مجھے صاف نظر آیا کہ اُمت کے اس انتشار کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب زکاۃ کی ادائیگی کا وہ ناقص نظام ہے جس نے ہماری اُمت کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ کیونکہ زکاۃ کی ''آزادانہ گردش'' کی وجہ سے ہر مدرسے اور ہر ادارے کو گویا کہ ''پروانۂ آزادی'' مل چکا ہے، لہذا اب وہ کسی کی ''اطاعت'' کا پابند کیوں رہے؟ یہ وہ بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے آج پوری اُمت سنگین نتائج سے دوچار ہے۔ اسی وجہ سے اسلام میں ''جماعتی زندگی'' کی سخت تاکید کرتے ہوئے یہاں تک کہا گیا ہے کہ جنگل میں بھی اگر دو افراد سفر کر رہے ہوں تو وہ اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنا لیں۔

لہذا موجودہ خرابیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ آج مسلمان ہندستان میں جتنی جلد ہو سکے زکاۃ کے اجتماعی نظام قائم کرنے کی طرف دھیان دیں، جو مسلمانوں کے لئے ''زندگی'' کی ایک علامت ہوگی اور اس کے ذریعہ مدرسوں کی ''آزادی'' پر بندش لگ جائے گی۔ اور اس کے نتیجے میں جو صالح ہیں وہ تو باقی رہیں گے اور جو غیر صالح ہیں وہ پانی کے جھاگ کی طرح ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر یہی صالح افراد ''اوپری دباؤ'' کے تحت اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے رہیں۔

امارت شرعیہ کی افادیت کیا ہے؟

آج کل ہندستان میں ''امارت شرعیہ'' کا ڈھول پورے زور وشور کے ساتھ پیٹا جارہا ہے، جس کی حیثیت ڈھول کے پول سے زیادہ نہیں ہے۔ اوراس کا تجربہ ناچیز کو اُس وقت ہوا جب ۱۹۷۴ء میں کرناٹک میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحریک کے اغراض ومقاصد کی تشہیراوراسے پروان چڑہانے کی راہ میں راقم نے پورے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ چنانچہ اُن دنوں راقم ماہنامہ ''تعمیر فکر'' نکالتا تھا، جس میں مسلم پرسنل لاء اور تحفظ شریعت پر علمی وشرعی نقطۂ نظر سے مضامین اور زوردار اداریئے لکھنے کے علاوہ امارت شرعیہ کے قیام کے بعد دو خصوصی شمارے ''امارت شرعیہ نمبر'' اور ''امارت نمبر'' کے ناموں سے نکالے اوران میں امارت شرعیہ کی اہمیت وافادیت پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مختلف زاویے پیش کئے۔ نیز ان میں نکاح، طلاق، نفقہ، عدت، وراثت، متبنّٰی بل وغیرہ مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے مضامین شائع کئے۔ اوران میں سب سے زیادہ خاص بات یہ تھی کہ اس تحریک کا بنیادی نقشہ وخاکہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ اس سے ہمارے اجتماعی مسائل حل ہوں گےاور صرف مسلم پرسنل لاء کے تحفظ ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ہمارے دیگر تعلیمی، معاشی، سماجی اور ملی مسائل بھی حل ہوں گے۔ چنانچہ میں نے ''امارت شرعیہ نمبر'' کے پہلے صفحے پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک تحریر نمایاں طور پر پیش کی تھی جو یہ ہے:

> ''میں نے بارہا کہا ہے اوراب پھر کہتا ہوں کہ اگر کسی ایک مرکز پر مسلمان مجتمع نہ ہوئے تو ہندستان آگے چل کر مسلمانوں کے لئے بڑا راجپوتانہ ثابت ہوگا، جس کا تھوڑا سا مزہ وہ چکھ چکے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حسب استطاعت ہم ایک عَلَم کے نیچے جمع ہوں، تاکہ ہمارے جمعہ وجماعت، ہمارے اعیاد ورویتِ ہلال، صوم وافطار اور زکاۃ وخیرات، ائمہ ومؤذنین، مکاتب ومدارس، مساجد ومقابر، نکاح

وطلاق، فسخ وتفریق، تبلیغ وارشاد اور دوسرے مذہبی صیغے اور شعبے کسی ایک انتظام میں آ جائیں اور مسلمان افراد کی رکھوالی اور دیکھ بھال، غریبوں کی امداد، یتیموں کی کفالت، بے نواؤں کی مدد، نومسلموں کی حفاظت، گمراہوں کی ہدایت وغیرہ کے کام تنظیم کے ساتھ انجام پاسکیں، اور ہماری مذہبی اور قومی خیرات کی کوڑی کوڑی سنّت نبویہ کے مطابق ایک بیت المال میں جمع ہوکر مستحقین میں خرچ ہوسکے، بالفعل ہماری شرعی امارت اسی تنظیم کا نام ہے''۔

غرض اُس موقع پر امارت شرعیہ کے قیام کا پروپگنڈہ نہایت درجہ زور وشور کے ساتھ کیا گیا اور اس کے لئے خصوصی جلسے منعقد کئے گئے اور شہر بنگلور کے بارہ علماء پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ بنائی گئی، جس کا ایک رکن یہ ناچیز بھی تھا، لیکن بعد کے حالات سے مجھے ایک دھکا لگا۔ یعنی امارت شرعیہ دار القضاء میں تبدیل ہوگئی اور بس۔ ظاہر ہے کہ دار القضاء الگ چیز ہے اور امارت شرعیہ دوسری چیز۔ امارت شرعیہ ایک ایسا باوقار منصب ومحکمہ ہے جو کسی علاقے کے مجموعی سدھار اور مسلم معاشرے کی اجتماعی فلاح و بہبود کی خاطر ہو۔ محض دار القضاء کے قیام کے لئے اس قدر ڈھول پیٹنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور پھر کچھ ہی عرصے میں مجلس شوریٰ ایک عضو معطل ہوکر رہ گئی۔ اس طرح یہ محض ایک سراب تھا جس کی کوئی حقیقت نہ ہو۔ ہندستان میں ''اماری'' اداروں کا حال تقریباً یہی ہے، جو برائے نام قائم ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور عبرت کی بات یہ ہے کہ آج کل بعض دار القضاؤں میں ''مُنہ دیکھے'' فیصلے بھی ہونے لگے ہیں۔ لہٰذا یا تو ان کی اصلاح ہو یا پھر جتنی جلد ہوسکے ان کو مقفّل کر دینا ہی بہتر ہے۔ بندہ نہایت صاف گو واقع ہوا ہے اس لئے وہ یہ سب باتیں محض اصلاح اُمت کی غرض سے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے صاف صاف سنا رہا ہے۔ خواہ میری باتیں ''الحق مُر''

کے مطابق کسی کو کتنی ہی کڑوی کیوں نہ لگ رہی ہوں۔ اب ہمارے قومی وملّی اداروں کو من مانی کرنے کا کوئی موقع نہ دینا چاہئے۔

بہر حال ان تمام قومی وملی خرابیوں کا واحد علاج اب زکاۃ کا اجتماعی نظام ہے۔ اگر مسلمانوں کے ارباب حل وعقد نے اس اہم اور بنیادی مسئلے کی طرف توجہ نہ کی تو پھر انہیں بے موت مرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ آج ہمارے سروں پر مختلف قسم کی ''تلواریں'' لٹک رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم مقابلہ آرائی کے لئے اُٹھ کھڑے نہیں ہوتے ہیں تو پھر ہماری تباہی کو دنیا کی کوئی بھی طاقت روک نہیں سکتی۔

تعلیمی مسائل اور میری سرگرمیاں

اس ناچیز کا شروع ہی سے یہ نظریہ رہا ہے کہ ملت اسلامیہ کی صحیح تعلیم وتربیت کے لئے دینی ودنیوی دونوں قسم کی تعلیم مشترکہ طور پر ہونی چاہئے۔ کیونکہ ان دونوں میں تفریق کی بنا پر آج ملت کو سخت نقصانات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ ایک طرف دینی مدرسے ہیں تو دوسری طرف انگریزی کے اسکول اور کالج، اور ان دونوں میں کہیں بھی ربط وضبط نظر نہیں آرہا ہے۔ اسی بنا پر خود راقم الحروف کو انگریزی اور جدید علوم کی تحصیل کے لئے سخت محنت کرنی پڑی۔ اس بنا پر قوم کی حالت زار دیکھ کر اکثر رونا آتا تھا کہ اصلاح کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟

خوش قسمتی سے ۱۹۷۰ء کے دہے میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی کے نام سے ایک نئی تعلیمی تحریک شروع ہوئی، جس کے بانی اور محرک جسٹس بشیر احمد سعید مدراس، ڈاکٹر ممتاز احمد خان بنگلور، جناب محمد علی مٹھا بمبئی اور ڈاکٹر پی کے عبدالغفور کیالی کٹ تھے۔ اور اس کا مقصد ہندستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لانا تھا۔ اور اس کے موضوعات میں دینی تعلیم کا مسئلہ بھی شریک تھا، جو میرے لئے باعث کشش ثابت ہوا۔ اس لئے بندہ بھی اس تحریک میں شریک ہوگیا

اوراس طرح مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر لکھنا شروع کردیا۔ چنانچہ یہ سوسائٹی ہرسال کسی ایک شہر میں ایک شاندار کانفرنس منعقد کرتی، جس میں ہندستان بھر کے مندوبین حصہ لیتے تھے۔ میں ۱۹۷۲ء میں بمبئ، ۱۹۷۳ء میں پٹنہ اور ۱۹۷۵ء میں کیالی کٹ کی کانفرنسوں میں شریک رہااور پہلے دومقامات میں اپنے مقالے پیش کئے۔ جس کے مطابق قدیم وجدید کی تفریق کومٹا کر نئے قسم کے مدرسے اور تعلیم گاہیں قائم کرنے کی اہمیت واضح کی۔ نیز اس کے علاوہ اپنے ماہنامہ تعمیرِ فکر کے دوخصوصی نمبر بھی ''ایجوکیشنل نمبر'' اور ''تعلیمی نمبر'' کے عنوانوں سے ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء میں شائع کئے۔ ان دونوں میں متعدد اہل علم وقلم کے اور دینی علوم میں بصیرت رکھنے والے علماء کے مقالات اور خصوصی ادارئے لکھے اور شائع کئے گئے۔ نیز ان کے علاوہ راقم نے ملّت کے مختلف تعلیمی مسائل ومشکلات پر وقتاً فوقتاً جوکچھ مضامین لکھے اُن سب کوایک کتاب میں جمع کر کے شائع کردیا جس کا نام ''ہمارے تعلیمی مسائل'' ہے۔ اس طرح بندہ نے تعلیمی مسائل وموضوعات پر کافی کام کیا ہے۔ ان دنوں تعمیرِ فکر محض اشتہارات کے بل بوتے پر چلتا تھا۔

ملّت کوتباہی سے بچایئے

بہرحال راقم کا پختہ اعتقاد ہے کہ جب تک دینی ودنیوی تعلیم پر مشتمل جامع قسم کے مدرسے یا کالج وجود میں نہیں آتے ہماری ملت کا بھلانہیں ہوسکتا۔ دوقسم کے مدرسے اس ملت کے لئے زہر ہلاہل ہیں۔ آج عالم اسلام جومختلف قسم کے ''طوفانوں'' کی زد میں ہے اُس کی بنیادی وجہ دین اور دنیا میں تفریق ہے۔ اسی بنا پر آج مسلمان جدید چیلنجوں کا مقابلہ کرنے میں پوری طرح فیل نظر آرہے ہیں۔ لہٰذا اب جتنی جلد ہوسکے اس اندوہناک صورت حال کوختم کرنا چاہئے۔ مگرسوال یہ ہے کہ اس کی ابتدا کون اور کیسے کرے؟ تومیری ناقص رائے میں اس کی ابتداء میں خود عمائدین ملت اور ہمدردانِ قوم آگے بڑھ کر آئیں اور ہندستان کے ہر بڑے شہر یا کم ازکم

ہر صوبے کے دارالحکومت میں ایک جامع اور ماڈل قسم کا مدرسہ یا کالج قائم کر کے اس کی ابتداء کریں، جو قوم وملت کے اُمنگوں کے مطابق ہو۔ اور یہ کام ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ کے لئے اہم ہی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس سلسلے میں راقم الحروف اپنے پچاس سالہ مطالعہ قرآن وحدیث کی رُو سے یہ فتویٰ صادر کرتا ہے کہ اس مقصد کے لئے زکاۃ کی رقم کا خرچ جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔ اور ملک و بیرون ملک کے موجودہ لرزہ خیز حالات کے پیش نظر نئے قسم کے مدرسوں کی ضرورت بے حد بڑھ گئی ہے۔

واضح رہے اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق نہیں ہے، لہٰذا وہ دینی و دنیوی علم میں بھی تفریق نہیں کرتا، بلکہ وہ ان دونوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ اسلام کا ایک بازو یا اُس کی ایک آنکھ شریعت ہے تو اُس کا دوسرا بازو یا اُس کی دوسری آنکھ فطرت (نیچر) ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جس طرح دینی وشرعی علم کو علم کہا گیا ہے اسی طرح ''علم فطرت'' کو بھی علم قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دیکھئے سورۂ یونس آیت نمبر ۵، عنکبوت ۴۱-۴۳ اور فاطر ۲۷-۲۸ وغیرہ۔ اس طرح قرآن حکیم کی نظر میں ''علم'' ایک وحدت ہے جس میں تفریق نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ آج علم فطرت یا سائنسی علوم میں پیچھے ہو جانے کی وجہ سے ہی مسلمان زندگی کے میدان میں مار پر مار کھا رہے ہیں اور ہر جگہ گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے ہیں۔ اور وہ پوری دنیا میں ذلیل ورسوا کئے جا رہے ہیں۔

چنانچہ اس سلسلے میں امام غزالیؒ نے تحریر کیا ہے کہ اہل اسلام کے لئے ہر اس علم کی تحصیل فرض کفایہ ہے جس کے عدم وجود کے باعث ملت کسی خرابی میں مبتلا ہو سکتی ہو (دیکھئے احیاء العلوم: ۱/۱۶، مطبوعہ بیروت)۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے راقم کی وہ کتابیں دیکھی جائیں جو زکاۃ کے موضوع پر ہیں۔ اس سلسلے میں خاص کر ''زکاۃ اور مصالح عامہ'' ملاحظہ ہو۔

لہذا اب عمائدین ملت پر بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کام میں مزید تساہل نہ برتیں، ورنہ قوم وملت کا خون ناحق اُن کی گردنوں پر ہوگا۔ اس لئے یہ ناچیز ملک کے تمام قائدین اور ہمدردان ملت سے عموما اور صوبہ ءکرناٹک کے عمائدین سے خصوصا گزارش کرتا ہے کہ وہ اس راہ میں بھی پہل کر کے ایک جامع قسم کا ''اسلامیہ کالج'' یا ''اسلامی مدرسہ'' قائم کردیں، تاکہ وہ دوسروں کے لئے ایک مثال بن سکے۔ یہ اسلام اور مسلمانوں پر ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی لیکن مسلمان آج بھی سیکڑوں سال پیچھے چل رہے ہیں۔ لہذا اب کرو یا مرو کا وقت آ گیا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت

مگر واضح رہے یہ مقصد برائے نام صرف چند نئے قسم کے مدرسے یا کالج کھول دینے سے کبھی پورا نہیں ہوسکتا، جب تک کہ یہ کام پورے اخلاص کے ساتھ اور اسلام کی اصل رُوح اور اسپرٹ کے مطابق نہ ہو۔ اور پھر یہ عمل ''جہادی'' نقطۂ نظر سے اور جہادی پیمانے پر ہونا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کی روح کے مطابق جہاد کی اصل حقیقت یہ ہے کہ اپنی وسعت وطاقت کے مطابق دین کی تبلیغ واشاعت میں اپنا سارا زور لگا دینا۔ جب کہ تلوار کے ذریعہ جہاد اصلا مطلوب نہیں بلکہ اُس کی حیثیت محض دفاعی ہے۔ لہذا مسلمان جب تک جہاد کی اصل حقیقت ونوعیت سمجھ کر اس پر عمل نہیں کرتے محض چند ''تبدیلیاں'' کردینے سے کوئی خاص مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ بہر حال میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ پانی سر سے بہت اونچا ہو چکا ہے، لہذا اب اُمت مسلمہ کو کارزار عمل میں فوراً کودنا چاہئے۔ اور خاموشی اُس کے لئے بالکل حرام ہے حرام ہے حرام ہے۔

اُٹھو وگر نہ حشر نہ ہوگا پھر کبھی

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اسلام ایک مکمل دین کس اعتبار سے؟

اسلام ایک کامل دین اور کامل شریعت کا حامل ہے۔اور قرآن ایک مکمل اور بے عیب صحیفہ ہے، جس طرح کہ یہ کائنات ایک مکمل یونٹ اور مکمل وحدت ہے۔اب ان تینوں میں ربط وتعلق یہ ہے کہ قرآن اور کائنات دین الٰہی (اسلام) کے دو بازو ہیں۔یعنی اسلام کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے تو دوسرے ہاتھ میں کائنات یا فطرت۔اور قرآن وہ جامع اور کامل دستورالٰہی ہے جس میں دین وشریعت اور صحیفۂ فطرت کے وہ تمام رُموز واسرار مذکور ہیں جو قیامت تک پیش آنے والے تمام فکری ونظریاتی (فلسفیانہ) مسائل کا تذکرہ اور اُن کا حل بھی ایک اعجازی انداز میں مذکور ہے، جو اہل اسلام کو ہر قسم کے ''فکری طوفانوں'' سے پنجہ آزمائی کرنے کے طور طریقے سکھاتا ہے اور کسی بھی حال میں انہیں بے یارومددگار نہیں چھوڑتا۔یہی کتاب الٰہی کا سب سے بڑا معجزہ اور اُس کا کمال ہے اور اسی بنا پر وہ ﴿هُدىً لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ہے، یعنی اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے ہدایت نامہ ہے۔اسی بنا پر فرمایا گیا ہے:

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرىٰ لِلْمُسْلِمِيْنَ.﴾ (نحل: ۸۹)

ترجمہ: اور ہم نے آپ پر وہ کتاب اُتاردی ہے جو ہر چیز (یا ہر مسئلے) کی خوب وضاحت کرنے والی ہے اور (اسی بنا پر) وہ اہل اسلام کے لئے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔

الغرض دین الٰہی دین اور دنیا یا فطرت وشریعت میں تفریق کرنا نہیں سکھاتا، کیونکہ اس

کے نتیجے میں مسلم معاشرے کے اندر نہ صرف فکری انتشار پیدا ہوتا ہے بلکہ اس تفریق کے باعث خلافت ارض کا میدان بھی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔لہٰذا اسلام نے فطرت وشریعت میں تفریق کی دعوت نہیں دی، بلکہ ان دونوں میں ربط وتعلق تلاش کرنے کی تلقین وتاکید کی ہے، تاکہ اس کے نتیجے میں اہل اسلام کی ہر ہر اعتبار سے کامل رہنمائی ہو سکے۔ارشاد باری ہے:

﴿ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضَ بِالْحَقِّ، إِنَّ فِيْ ذٰلِکَ لَأٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. ﴾ (عنکبوت: ۴۴)

ترجمہ: اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حقانیت (حکمت ومصلحت) کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس (مظہرِ رُبوبیت) میں اہل ایمان کے لئے یقیناً ایک (بہت بڑی) نشانی موجود ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے، ورنہ پورا قرآن اس قسم کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے۔اس لحاظ سے اسلام کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں صحیفہء فطرت ہے۔اسی بنا پر قرآنی علم اور کائناتی علم میں کوئی تعارض وتضاد قطعاً موجود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی سرچشمہء رُبوبیت سے صادر شدہ ہیں۔ چنانچہ صحیفہء الٰہی خداوند علیم وخبیر کے علم ازلی کا مظہر ہے تو صحیفہء فطرت اُس کی قدرت وخلاقیت کی نمائندگی کرنے والا ہے۔اور ان دونوں کی تطبیق وہمنوائی سے دین وشریعت اور فکر وفلسفے کے تمام اُلجھے ہوئے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور شکوک وشبہات کے تمام بادل چھٹ جاتے ہیں۔اور پھر ان خدائی تجلّیوں کے نتیجے میں کفر وشرک اور الحاد ولادینیت کے تمام قلعے مسمار ہو کر ریت کے تودوں کی طرح ڈھیر ہو جاتے ہیں۔یہ ہے وہ بنیادی مقصد جس کی بنا پر اسلام فطرت وشریعت کا جامع اور ان دونوں کی تطبیق کا علمبردار دکھائی دیتا ہے۔لہٰذا جب تک یہ حقیقت اہل اسلام کے حلق کے نیچے نہ اُترے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی صبح نو کبھی طلوع نہیں ہو سکتی اور مادی والحادی فلسفوں کا تاریک سایہ اُس کے اوپر منڈلاتا رہے گا۔اس لئے اہل اسلام کو

مکمل اور کامل دین کی پیروی کرتے ہوئے اور ان دونوں علوم کے جامع بن کر ایک طرف دین وشریعت کی خدمت کرنا ہے تو دوسری طرف بھٹکے ہوئے اور حائر وسرگرداں بنی آدم کی بھی صحیح صحیح رہنمائی کرتے ہوئے انہیں خدائی سرچشمہء ہدایت کی طرف لانا ہے۔ یہ اہل اسلام کا وہ شرعی ودائمی فریضہ ہے، جس سے مفر کی اُن کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ورنہ وہ اللہ کے نزدیک مجرم اور گنہگار رہوں گے۔

اہل اسلام کا ایک اجتماعی فریضہ

یہ کام چونکہ اجتماعی نوعیت کا ہے اور مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے۔ لہذا تمام اہل قبلہ کو اپنے تمام مسلکی اور علاقائی اختلافات کو برطرف کر کے ایک جسد واحد کی طرح متحد ہو جانا چاہئے۔ کیونکہ یہ ایک فکری ونظریاتی معرکہ ہے جو کفر والحاد کے خلاف اور دین متین کی حمایت ودفاع میں ہر ہر مسلمان پر یکساں طور پر عائد ہوتا ہے، لہذا اُمت کے تمام مکاتب فکر اور تمام جماعتوں کو یک جُٹ ہو کر اس فریضے کو ادا کرنے کی راہ میں جہادی پیمانے پر کام کرنا ضروری ہے۔ ورنہ جب کفر کی طاقتیں اہل اسلام پر یلغار کرتی ہیں تو ''الکفر ملة واحدة'' کے مطابق باہم متحد ہو کر تمام مسلمانوں کا بلا تفریق مسلک و جماعت صفایا کر دیتی ہیں۔ اور وہ حنفی وشافعی، دیوبندی وبریلوی اور اہل حدیث اور غیر اہل حدیث کسی کی بھی تمیز نہیں کرتیں۔ لہذا اب ان طاغوتی طاقتوں کے خلاف تمام مسلمانوں کو بھی اپنے باہمی اختلافات دفن کر کے متحد ہو جانا چاہئے ورنہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا ہم محض خواب ہی خواب دیکھتے رہ جائیں گے۔ یہ کاتب تقدیر کا فیصلہ اور نوشتہء الٰہی ہے، جسے اگر اہل اسلام نے نظر انداز کر دیا تو پھر اُمت کو بہت بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ کیونکہ آج کل عالم اسلام پر خطرات کے جو بادل منڈلا رہے ہیں اُن کے مقابلے کا یہی ایک راستہ ہے۔

﴿ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّطْفِؤُا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ، وَيَأْبىٰ اللّٰهُ إِلآَّ أَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ . هُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدىٰ وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلىٰ الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. ﴾ (توبہ: ۳۲-۳۳)

ترجمہ: وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ سے بجھا دیں، (لیکن) اللہ اس سے انکار کرتا ہے کہ وہ اپنا نور (اسلام) پورا کر کے ہی رہے گا، اگر چہ منکرین اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تا کہ وہ اسے تمام دینوں (اور فلسفوں) پر غالب کر دے اگر چہ مشرکین کو یہ بات نا گوار ہی کیوں نہ ہو۔

ان آیات کی تفسیر میں مفسرین نے تحریر کیا ہے کہ اسلام کا یہ غلبہ اور دبدبہ فوجی وعسکری اور علمی واستدلالی دونوں میدانوں میں مطلوب ہے۔ لیکن آج مسلمان چونکہ پہلے میدان میں پوری طرح مغلوب ہیں لہذا اب اُن کے سامنے علم واستدلال اور دلیل وحجت ہی کا میدان باقی رہ گیا ہے۔ اور اب وہ اس میں اپنا پورا زور لگا کر عالم انسانی کو یا تو راہ ہدایت سے ہمکنار کر سکتے ہیں یا اُس پر اللہ کی حجت پوری کر کے عنداللہ اور عندالناس سرخرو ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ باندھے بیٹھے رہے تو پھر اس سے زیادہ محرومی اور بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ نے کام بتا دیا اور کام کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا تو پھر دین اسلام کے ''علمبرداروں'' کو آگے بڑھنے میں تامل کیوں ہو رہا ہے؟ یہ وقت کا سب سے بڑا سوال ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۰ پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے۔ اگر اس کے مطابق تمام مسلمانوں نے مل کر عالم انسانی کی اصلاح ورہنمائی کے لئے ایک جماعت تیار نہ کی تو پھر تمام مسلمان یکساں طور پر گنہگار ہو جائیں گے اور قیامت کے دن اُن کا کوئی بھی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ اور اس علم سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے باعث دنیا میں مسلمانوں کی جو ذلت ورسوائی ہو رہی ہے وہ بھی صاف ظاہر ہے۔ اس طرح

مسلمان دونوں جہانوں میں ناکام ونامراد ثابت ہوجائیں گے۔

قرآن کا نظام دلائل

چونکہ سائنسی علوم کے تعلق سے اہل اسلام کے درمیان کافی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جو ان علوم سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ لہذا اہل اسلام کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی غرض سے راقم نے اپنی تصنیفات میں جا بجا اس موضوع پر بحث کی ہے اور کئی مضامین بھی لکھے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر میری سب سے زیادہ جامع او رمدلّل کتاب ''قرآن عظیم کا نظام دلائل اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ'' چھپ کر تیار ہوگئی ہے جو میرے پچاس سالہ مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر عالم دین کو کرنا ضروری ہے، تاکہ سائنسی علوم کے تعلق سے پیدا ہونے والے تمام شبہات واعتراضات کافور کی طرح رفع ہوجائیں۔ یہ کتاب علمائے اسلام کے لئے آخری درجے کی حجت ہے، جس میں قرآنی دلائل اور حقائق ومعارف کا ایک انبار جمع کردیا گیا ہے۔

اس کتاب میں قرآن عظیم کے نظام دلائل اور خلافت ارض کے فلسفے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ربط وتعلق قرآن کے ابدی حقائق کی روشنی میں واشگاف کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی طرح اس میں سائنسی علوم کے معتبر اور قابل استدلال ہونے پر نہ صرف قرآنی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ علمی وعقلی اعتبار سے بھی ناقابل تردید حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ یہ میری علمی زندگی کی سب سے اہم تحقیق ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ جل شانہ نے اس فقیر حقیر کو اسی کام کے لئے پیدا کیا تھا۔ تاکہ ان مفید علوم سے ناطہ دوبارہ جوڑنے کے سلسلے میں اہل اسلام کے لئے کسی بھی قسم کے عذر کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔

﴿ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُوْ الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ. ﴾

اسلامی فکر و فلسفے پر بعض ادھوری تحقیقات

میری پوری علمی زندگی قرآن حکیم کے گرد گھومتی رہی، جسے میں نے تمام علوم وفنون اور جملہ مسائل حیات میں ایک مرکز ومحور تصور کرتے ہوئے ہر مسئلے اور ہر قضیے میں اس سے روشنی حاصل کرنے کی سوچ بچار اور جدوجہد میں مشغول رہا۔ اور قرآن کا یہ نشہ میرے سر سے کبھی اُتر نہ سکا۔ مجھے اس راہ میں بڑی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ یہی نہیں بلکہ میں نے اسلام اور قرآن کے خلاف کسی بھی معترض یا اُس سے غلط استدلال کرنے والے کا جواب خود قرآن حکیم کے ابدی نصوص وحقائق کی روشنی میں دے کر اُس کی زبان بندی کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ جس کتاب نے مجھے قرآن اور سائنس کا پوری سنجیدگی کے ساتھ تحقیقی مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا تھا، یعنی ڈاکٹر برق کی کتاب ''دو قرآن'' (جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے) خود اس کا بھی معقول اور مدلل جواب میں نے ایک مقالے کے ذریعہ دیا جس کا عنوان ''قرآن اور سائنس کے چند اُصول وکلیات'' ہے جو ''ندائے فرقان'' کے دوسرے شمارے میں شائع ہوا۔ ندائے فرقان کا یہ شمارہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا، جواب میری کتاب ''اسلام اور جدید سائنس'' میں شامل ہے۔ اسی طرح میں نے متعدد معترضین اور متجددین کا جواب خالص قرآنی حقائق کی روشنی میں دیا ہے۔ اور یہ باریٔ تعالیٰ کی مجھ پر ایک بہت بڑی نعمت اور اُس کا فضل واحسان ہے کہ اُس نے مجھے اس قابل بنایا۔

لیکن مجھے انتہائی افسوس ہے کہ سوائے چند کتابوں کے مجھے پورے سکون اور یکسوئی کے ساتھ پیش آمدہ مسائل میں تحقیق وتصنیف کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ بلکہ میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ ہنگامی حالات اور شدید مصروفیات کے عالم میں لکھا۔ ورنہ میں اُمت کی اور بھی زیادہ اور بہتر خدمت کر سکتا تھا۔ اور یہ میری ہی نہیں بلکہ اُمت کی بدقسمتی ہے کہ اُس نے میرے کام اور میری صلاحیتوں کو پہچانا نہیں، جس کی وجہ سے اکثر وبیشتر ہمت شکنیوں سے سابقہ پڑا اور دربدر کی

ٹھوکریں کھاتے رہے۔ یہ ایک عبرتناک داستان ہے، جس کی بعض تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔ اس موقع پر مجھے اپنی بعض ادھوری تحقیقات کا تعارف کرانا ہے جو اسلامی فکر و فلسفے یا کلامیات قرآن سے متعلق ہیں:

ا- میری ایک اہم ترین تحقیق نظریہء ارتقا کے خلاف ہے، اور یہ نظریہ موجودہ تمام الحادی فلسفوں کے لئے ''رحم مادر'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی عصر جدید کے تمام مادی وملحدانہ فلسفے اسی ''مادر مہربان'' کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس نظریئے سے میں اپنی طالب علمی کی زندگی میں متعارف ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد میں نے اس موضوع پر معلومات اکھٹا کرنا شروع کر دیا۔ نیز اس کے علاوہ قرآن اور حدیث کے وہ حقائق بھی اکھٹا کرتا رہا جو اس گمراہ کن نظریئے کے خلاف تھے۔ اور دوسری طرف حضرت آدم علیہ السلام کی شخصیت پر بھی قرآن اور حدیث سے وہ دلائل فراہم کر لئے جن کو نظر انداز کر کے بعض بڑے بڑے علماء تک ابوالبشر کی شخصیت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ جب کہ بعض متجددین نے حضرت آدمؑ کے واقعے کو محض ایک تمثیل قرار دے کر اُن کی شخصیت سے انکار کر دیا تھا۔ اس کام کے لئے بندہ کو تقریباً پورا ذخیرۂ حدیث چھاننا پڑا۔ پھر ۱۹۸۰ء کے دہے میں اس موضوع پر قلم اُٹھا کر ایک معرکے کی کتاب ''تخلیق آدم اور نظریہء ارتقاء'' کے نام سے شائع کی، جو بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اسے پاکستان کے کم از کم (میرے علم کے مطابق) تین ناشروں نے بیک وقت شائع کر کے خوب پیسہ کمایا۔

لیکن اس موضوع پر میرے پاس اتنا وسیع مواد موجود ہے کہ مزید کئی کتابیں وجود میں آ سکتی ہیں، جن میں ایک کتاب ''سیرت آدم'' کے نام سے بھی منظر عام پر آ سکتی ہے۔ جب کہ خالص علمی و سائنسی دلائل پر ایک اور کتاب ''قرآن حکیم اور نظریہء ارتقا'' کے عنوان سے بھی لباس وجود میں جلوہ گر ہوسکتی ہے۔ یہ اتنا وسیع موضوع ہے کہ اس پر دفتروں کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے

ہیں۔مگر افسوس کہ اب میرا وقت شاید قریب آ چکا ہے، لہٰذا اب یہ کام شاید ہی پورا ہو سکے۔

۲-حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہماری زمین پر جنات آباد تھے، جن کا تذکرہ قرآن میں اشاروں کنایوں میں موجود ہے۔اور پھر اس مخلوق کی بہت سی تفصیلات قرآن اور حدیث میں پوری صراحت کے ساتھ مذکور ہیں۔مگر بعض ''روشن فکر'' جنّوں کو گوشت پوست کی مخلوق ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔چنانچہ ان کو قائل کرانے کی غرض سے بندہ نے قرآن حدیث کے وہ حقائق اکھٹا کرنا شروع کردئے جن کی رُو سے ان کا نہ صرف گوشت پوست کی مخلوق ہونا ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا ایک باقاعدہ معاشرہ بھی موجود ہے اور ان میں بھی انسانوں ہی کی طرح نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔چنانچہ اس سلسلے کے بہت سے علمی حقائق اکھٹا کر لئے گئے ہیں، مگر انہیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں لایا نہیں جاسکا۔اگر یہ کتاب منظرِ عام پر آ جائے تو ''منکرین جنّ'' کا مُنہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔اور یہ حقائق قرآن اور حدیث کے ''نُصوص'' کے ذریعہ اکھٹا کئے گئے ہیں، جن کا انکار قرآن اور حدیث کا انکار ہوگا۔

۳-''قیامت کا ثبوت: سائنٹفک نقطۂ نظر سے''۔اس موضوع پر راقم نے اپنی تصنیفات میں جا بجا بحث کی ہے اور خاص کر اپنی کتاب ''قرآن حکیم اور علم نباتات'' میں ایک پورا باب بھی تحریر کردیا ہے۔مگر اس موضوع پر ایک پوری کتاب لکھنے کے ارادے سے مواد اکھٹا کرنا شروع کردیا تھا، جس میں قدیم فلاسفہ کے نظریات سے بحث کر کے اُن کے اس بے بنیاد نظریئے کی تردید کی جائے کہ ''معاد صرف روحانی ہوگی، جسمانی نہیں''۔چنانچہ یہ عقیدہ بعض مسلم ممالک میں اور خاص کر مصر میں آج بھی پایا جارہا ہے۔مگر میری یہ بحث بھی اب تک ادھوری پڑی ہوئی ہے۔

۴-کلامیات قرآن کے موضوع پر میرے بعض اہم مضامین اب تک ادھورے پڑے

ہوئے ہیں۔

۵-اسلامی اور غیر اسلامی ''تصوف'' قرون وسطی کے بعض انتہاء پسند صوفیا اور خاص کر ابن عربی نے فلسفہء یونان سے متاثر ہوکر ایک نیا عقیدہ ''وحدت الوجود'' کے نام سے ایجاد کر کے اس پر اسلام کا ''لیبل'' چڑھا دیا تھا۔ یہ گمراہ کن نظریہ بعض مسلم حلقوں میں بہت مقبول ہوا اور اس کے ''بقیة الباقیة'' آج بھی پائے جا رہے ہیں۔ اگر علامہ ابن تیمیہؒ نے اس کی سخت مخالفت نہ کی ہوتی تو شاید اس کا حلقہء اثر بہت بڑھ جاتا۔ لہذا ارادہ تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھا جائے۔ اس مقصد کی غرض سے بیرونی ممالک کے اسفار کے دوران اس موضوع پر کافی کتابیں خرید لیں۔ مگر اس پر تفصیل سے لکھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ صرف ایک مختصر سی بحث لکھی تھی جو میری کتاب ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: قرآن کی نظر میں'' شائع ہو چکی ہے۔

۶- ۱۹۸۳ء میں لندن میں اسلامی سیاسیات کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جس میں شرکت کے لئے مجھے دعوت نامہ ملا تھا۔ تو اس کے لئے ایک مقالہ عربی میں لکھنا پڑا۔ مگر بعض وجوہات کی بنا پر میں اس میں شریک نہیں ہو سکا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد اس بحث کو مکمل کرنے کے لئے ایک اور مقالہ عربی میں لکھا۔ تا کہ ان دونوں کو ملا کر کتابی شکل میں شائع کیا جا سکے۔ پھر اس بحث کو اردو میں بھی کافی اضافوں کے ساتھ مکمل کیا۔ مگر یہ مقالات اب تک غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔

تفسیر اسرار القرآن

۷- ایک عرصہ دراز سے یہ خواہش میرے دل کے گوشوں میں کروٹیں لے رہی تھی کہ قرآن حکیم کے بعض منتخب سورتوں کی تفسیر اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے کی جائے، جو ایک بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔ مگر اس اہم کام کے لئے جس قدر سکون اور یکسوئی کی ضرورت تھی وہ کبھی میسر

نہ آئی۔ ۱۹۹۶ء میں جب کہ اکیڈمی ایک نئے مقام پر آ گئی تو قدرے سکون ضرور ملا مگر اس عرصے میں اپنی متعدد تحقیقات کو مکمل کرنے میں لگا رہا۔ اس دوران اکیڈمی کی لائبریری وسائل کی کمی کی وجہ سے دو مقامات میں بٹی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے کتابوں سے مراجعت میں کافی دشواری ہوتی تھی۔ اللہ اللہ کر کے جب ۲۰۰۰ء میں اکیڈمی کی ذاتی عمارت بن گئی تب جا کر سکون واطمینان حاصل ہوا۔ اور ''تفسیر اسرار القرآن'' کے نام سے بعض سورتوں کی تفسیر لکھنی شروع کر دی جو زیادہ تر نامکمل ہیں۔ میں نے اس مقصد کے لئے چند ایسی سورتوں کو منتخب کیا ہے جو ''آیات اللہ'' یا دلائل رُبوبیت کے تعلق سے انتہائی اہم ہیں۔ اور اُن کا تعلق خصوصی طور پر ''اَقسام القرآن'' سے بھی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر تحقیقات جدیدہ کی روشنی میں بعض ایسے حقائق پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جن پر اب تک کسی بھی مفسر کی رسائی نہیں ہو سکی ہے۔ یہ حقائق صرف علمی دنیا ہی کو چونکانے والے نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کو بھی متنبّہ اور خبردار کرنے والے ہیں کہ قرآن عظیم کو اب اور زیادہ نظر انداز نہ کیا جائے۔

غرض بندہ نے سورۂ تکویر کی تفسیر مکمل کر لی ہے، جو اشاعت کے لئے بالکل تیار ہے۔ اور یہ سورت میرے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لئے نہایت درجہ موزوں معلوم ہوئی جو ایسے عجیب وغریب حقائق پر مشتمل ہے جس میں اسلام کے تمام بنیادی عقائد کا اثبات خالص سائنٹفک نقطۂ نظر سے ہوتا ہے اور کسی بھی منکر ومعاند کو ان حقائق کا انکار کرنے کی مجال نہیں رہ جاتی اور یہ قرآن عظیم کی ایک نہایت درجہ اہم اور منفرد سورت ہے جو پوری دنیائے انسانیت کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے قرآن عظیم کے معجزہ ہونے کی نوعیت واضح کرتی ہے۔ یہ کتاب (تفسیر سورۂ تکویر) پریس جانے ہی والی ہے۔

اب مجھے نہایت درجہ افسوس ہو رہا کہ یہ کام بہت پہلے شروع کر دینا چاہئے تھا۔ مگر خدا

کے کام خدا ہی جانے، ہر چیز تقدیرِ الٰہی کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا انسان لاکھ کوشش کرے مگر ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہوں کہ کیا عجب کہ باریٔ تعالیٰ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے کسی اور کو بھی تیار کر رہا ہو۔

بہر حال اس بندۂ حقیر سے جو کچھ بھی بن پڑا اُس میں میں نے کتاب الٰہی کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بلکہ ہمیشہ قرآنیات اور قرآنی کلامیات ہی سے شغف رہا۔ اللہ سے بس دن رات یہی دعا ہے کہ وہ میری خدمات کو شرف قبولیت بخشے اور انہیں تمام انسانوں کے لئے مقبول اور نافع بنائے۔

بعض تیار شدہ تصنیفات

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا بندہ کو ۱۹۹۶ء میں اپنی ہنگامی زندگی سے چھٹکارا ملا تو اب میری واحد مصروفیت یہ تھی کہ اب میں اپنی ادھوری تحقیقات کو مکمل کروں۔ چنانچہ پچھلے پانچ سالہ عرصے میں کئی کتابیں مکمل کر کے شائع کر چکا ہوں۔ اب تک کی شائع شدہ تصنیفات کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ اور اب جو کتابیں اشاعت کے لئے پوری طرح تیار ہیں وہ یہ ہیں:

۱- تفسیر سورۂ تکویر اور اُس کے اسرار و عجائب

۲- ماہیت باریٔ تعالیٰ پر ایک نظر: قدیم و جدید نظریات کی روشنی میں

۳- قرآن کا نظریۂ علم: سائنسی اکتشافات کی روشنی میں

۴- فطرت و شریعت میں مشابہت: اور عصر جدید میں اس کی تجلّیاں

۵- عالم رُبوبیت میں توحید شہودی کے جلوے

۶- قرآن عظیم کا نظام دلائل اور ملّت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ

۷- قرآن کی حجّت عالم انسانی پر

۸-قرآن کا فلسفہء کائنات اور اُس کی ابدی سچائیاں

۹-جدید علم کلام کیا ہے؟ ایک تعارف

۱۰-قرآن اور سائنس میں کیا تعلق ہے؟ (عوام کے لئے)

۱۱-خلافت ارض کے لئے علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

۱۲-مصر کی اسلامی کانفرنس کی رپورٹ

۱۳-سفر نامہء مصر اور فرعونیات پر ایک نظر

۱۴-اسلامی شریعت کی معقولیت اور اس پر تحقیقی کام کی ضرورت

۱۵-اسلامی سیاست کے چند اُصول

۱۶-زکاۃ کے اجتماعی نظام پر سیمنار کی رپورٹ

ان کے علاوہ متعدد انگریزی تراجم اور بعض عربی تصنیفات بھی اشاعت کے لئے تیار ہیں۔ نیز انگریزی میں ترجمے کا کام بھی مسلسل ہو رہا ہے۔ میری تصنیفات کو انگریزی میں منتقل کرنے کا کام اب تک جناب خالد عرفان صاحب (ایم ایس سی) کرتے رہے ہیں۔ مگر اب یہ خدمت میرے ایک لڑکے مولوی سعید الرحمٰن ندوی (ایم اے) انجام دے رہے ہیں۔ ایک کتاب کا ترجمہ میرے بھتیجے داماد عبداللہ زبیر B.Sc نے اور ایک کتاب کا جناب مقبول احمد سراج جرنلسٹ نے بھی کیا ہے۔ اسی طرح میری بعض کتابوں کا عربی ترجمہ بعض ندوی احباب نے کیا ہے، جب کہ زیادہ تر کتابیں میں نے عربی میں براہ راست لکھی ہیں۔ اور اللہ کا فضل و کرم ہے کہ جدید عربی میں لکھنے کی بندہ کو کافی مشق ہے۔ جن احباب نے عربی میں ترجمہ کیا ہے ان میں مولانا ابراہیم ندوی، مولانا اکرم ندوی اور مولوی ثناء اللہ ندوی ہیں۔ اور ان کی ترجمہ کی ہوئی بعض کتابیں ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔

اس لحاظ سے اکیڈمی کی مطبوعات کی تعداد انشاء اللہ عنقریب ایک سو سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اور ان کتابوں کی محض فہرست دیکھ کر ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کام اپنی نوعیت میں کتنا اہم اور عظیم ہے۔ چنانچہ بعض مسائل و موضوعات تو ایسے ہیں جو برصغیر ہندو پاک تو درکنار پورے عالم اسلام کے لئے بالکل نئے اور انوکھے ہیں۔ اور یہ سب بفضل الٰہی قرآن عظیم میں مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اس توفیق الٰہی پر بندہ بارگاہ الٰہی میں جھکا جا رہا ہے کہ اُس نے اس ناچیز کو اتنا بڑا اشرف عطا کیا کہ وہ صحیفہ الٰہی کے بعض رازہائے سربستہ کو کھول کر دنیائے انسانیت کو اس کی تجلّیوں سے روشناس کرا سکے۔ **فالحمد لله علی ذلک۔**

ایک قرآنی انسائیکلوپیڈیا کی ضرورت

اہل اسلام کے ذمہ ایک تو قرآن اور جدید علوم کے تعلق سے تحقیق و ریسرچ کا کام ہے تو دوسرا قرآن حکیم کا ایک انسائیکلوپیڈیا یا دائرۃ المعارف بھی تیار کرنا ہے، جس میں قرآن میں مذکور افراد و اشخاص، اقوام عالم و مذاہب، مقامات و وقائع، قصص و کتب، حیوانات و نباتات، اُس کے بیان کردہ مظاہر و موجودات، جغرافیائی حقائق اور اُس کے علوم و معارف وغیرہ پر تعارفی مضامین انسائیکلوپیڈیائی طرز پر مرتب کئے جائیں۔ چنانچہ راقم یہ تحریک اکیڈمی کے قیام کے بعد برابر چلاتا آ رہا ہے۔ کیونکہ دنیا کے بہت سے مذاہب نے اس قسم کے انسائیکلوپیڈیا مرتب کر دئے ہیں جو کسی پر تحقیقی کام کرنے والوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں خاص کر یہود و نصاریٰ نے تو بہت سے دائرۃ المعارف شائع کر دی ہیں، حتیٰ کہ اب بچوں کے لئے اس قسم کی کتابیں نہایت درجہ جامع اور مؤثر انداز میں شائع کر کے اپنے اپنے مذاہب کی تبلیغ و اشاعت میں پوری طرح جُٹ گئے ہیں۔ حالانکہ ان کی مذہبی کتابیں یعنی تورات اور انجیل اب مُردہ ہو چکی ہیں۔ مگر حیرت اور

افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ایک زندہ کتاب کے حامل ہونے کے باوجود اب تک کوئی ایک بھی انسائیکلوپیڈیا مرتب نہیں کر سکے ہیں، جوان کے لئے ایک شرم کی بات ہے۔ حالانکہ ہر سال میلاد کے جلسوں پر اور ریلیف کے کام پر لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپئے خرچ کر دیتے ہیں۔ لیکن کسی ٹھوس کام کرنے کا انہیں خیال تک نہیں آتا۔

بہر حال یہ کام ریسرچ کے کام سے زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ اس میں تحقیق کرنے کے بجائے صرف ''معلومات'' اکٹھا کرنی پڑتی ہیں۔ مگر یہ بھی ایک ٹیم ورک کا طالب ہے اور اس پر ایک خطیر رقم بھی خرچ کرنی پڑے گی۔ اور یہ کام سالوں سال کی محنت شاقہ کے بعد ہی مکمل ہوسکتا ہے۔ غرض جب تک یہ دو بنیادی نوعیت کے کام پورے نہیں ہوتے اُمت مُسلمہ سرخرو نہیں ہوسکتی۔

اہل اسلام کی سر بلندی قرآن کی سر بلندی میں

اس سلسلے میں ایک عبرت کی بات ملاحظہ ہو کہ عیسائی دنیا یورپ، امریکہ، آسٹریلیا اور آفریقہ کو عیسائی بنانے کے بعد اب ایشیاء کو عیسائی بنانے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں پوپ جان پال نے جب ہندستان کا دورہ کیا تھا تو اُنہوں نے کھلے عام اعلان کیا تھا کہ اب تیسرے ہزارہ (تیسرے ہزار سالہ) میں ایشیاء کو عیسائی بنانا ہے۔ اس طرح عیسائی قوم کسی کام کو کرنے کے لئے ایک ہزار سال پہلے ہی سے منصوبہ بندی شروع کر دیتی ہے اور پھر منظّم طور پر کام کرتے ہوئے اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک مردہ کتاب کی مالک ہے۔ لیکن حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان ایک زندہ کتاب کے مالک ہوتے ہوئے بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ اُن کے پاس وسائل کی کوئی کمی نہیں ہے۔ تو اُمت مسلمہ کے اس فعل کو غفلت ولا پرواہی قرار دیا جائے یا کاہلی اور کام چوری؟ واضح رہے مسلمانوں کی سر بلندی خوش حال زندگی یا اونچی اونچی عمارتیں کھڑا کر لینے یا عالی شان

مدرسے اور کالج قائم کردینے میں نہیں بلکہ اسلام کی سربلندی میں ہے اور اسلام کی سربلندی قرآن کی سربلندی میں ہے۔ چنانچہ قرآن کا پُھریرا جب تک آفاق عالم پر لہرانہ دیا جائے یہ اُمت عالم پستی سے کبھی اُبھر نہیں سکتی، اگرچہ اُس کی ظاہری شان وشوکت نگاہوں کو چکا چوند کرنے والی کیوں نہ بن جائے، جو محض ایک سراب کی طرح ہے۔ جس کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔

لہذا اب ہم کو قرآن عظیم کا پُھریرا پھر سے آفاق عالم پر لہرانے کے لئے پوری طرح کمر کس لینا چاہیئے۔ جب تک ہم قرآن اور اُس کے پیغام کو زندہ نہیں کریں گے، ہم ہمیشہ ایک مُردہ قوم کی طرح رہیں گے، جس میں زندگی کے کوئی آثار نہ ہوں، اگرچہ وہ بظاہر زندہ نظر آرہی ہو۔ اہل اسلام کی زندگی قرآن کی زندگی میں ہے۔ لہذا قرآن کو ٹھنڈے بستے میں ڈال کر وہ کبھی اور کسی بھی طرح اُبھر نہیں سکتے۔ یہ خدا اور اُس کے رسول کا فیصلہ ہے۔

گر در خانہ کس است یک حرف بس است

☆☆☆☆☆

دوسرا باب:

میری زندگی عبرتوں کا ایک مُرقّع

میرا موجودہ حال زار

یہ فقیر حقیر اس وقت اپنی زندگی کی آخری منزلوں میں ہے اور سفر آخرت کی تیاری کر رہا ہے۔ یکم رجب ۱۴۲۲ھ کو عمر کی ۷۲ منزلیں پوری ہو چکی ہیں۔ پورے پچاس سال تک علمی جدوجہد ہی نہیں جہاد کرتے کرتے میرے بازو شل ہو چکے ہیں اور جسم کے سارے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے ہیں اور اب میں بالکل ادھ مُوا ہو چکا ہوں۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کے پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر موت وحیات کی کش مکش سے دوچار ہوں۔ اور ان میں سب سے بڑا اُم الامراض ذیابطیس ہے۔ بعض امراض تو پورے تیس سال سے میرے ''جیون ساتھی'' بنے ہوئے ہیں۔ اب اس پر مستزاد ایک نئی آفت یہ آپڑی ہے کہ میری آنکھوں کی بینائی جواب دینے کی منزل میں ہے۔ ایک آنکھ کا آپریشن ہوا مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب آنکھ کی بینائی بڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے، جو ذیابطیس کا اثر ہے۔ اس وقت چشمہ کام نہیں کر رہا ہے۔ صرف ایک آنکھ سے تھوڑا بہت نظر آتا ہے۔ ہر چیز دھندلی دکھائی دیتی ہے۔ مطالعہ چھوٹ چکا ہے۔ جن

کتابوں کو سخت محنت و مشقت کے ساتھ جمع کیا تھا اُنہیں اب حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوں۔ اس وقت یہ سطریں محدب شیشے کی مدد سے بمشکل تمام لکھ رہا ہوں اور مجھے کوئی اُمید نہیں ہے کہ اب میں اپنی ادھوری تصنیفات اور مُسودات کو مکمل کرسکوں گا، اِلّا یہ کہ خداوند کریم کی جانب سے کوئی نشانِ رُبوبیت ظاہر ہوجائے۔ **وماذلک علی الله بعزیز۔**

میرا مشن پورا ہو چکا ہے

اس لئے بندہ اس موقع کو غنیمت جان کر اپنی داستانِ حیات کے کچھ تلخ حقائق اور کچھ تلخ تجربات بیان کردینا چاہتا ہے، تاکہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں۔ کیونکہ ملت کی اصلاح اور تعمیرِ نو کا کام ایک کٹھن مرحلہ ہے۔ اور یہ ایک ایسا خارزار ہے جس میں اچھے اچھے جواں مرد بھی دو چار قدم سے زیادہ نہیں چل سکتے۔ یہ تو قرآن عظیم ہی کا فیض تھا کہ میں اس خارزار کو پوری طرح عبور کرلیا اور میرا عزم بالجزم مجھے کبھی پیچھے ہٹا نہ سکا۔ بلکہ میں نے اس راہ میں کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ناکامیوں اور دل شکنیوں کے باوجود ہمیشہ راستہ بنا کر آگے ہی بڑھتا رہا۔ چنانچہ اس پچاس سالہ والہانہ جدوجہد میں میرے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آسکی۔ کیونکہ میں نے قرآن اور سائنس کے ''معمے'' کو پوری طرح حل کر کے کتاب حکمت کے سربمہر خزانے کو کھولنے کی ''چابی'' دریافت کرلی تھی۔ لہٰذا جب میں نے قرآن عظیم کے ''اندرون'' کی جھلک دیکھ لی اور اُس کی تجلّیوں نے مجھے خیرہ کردیا تو اس جلوۂ الٰہی سے میں مسحور ہو کر رہ گیا۔ لہٰذا اب میں پچھلے ۳۳ سال سے کتاب الٰہی کا یہ جلوہ اہل اسلام کو دکھانے کی کوشش میں تن من دھن کی بازی لگا کر پوری طرح جتا ہوا ہوں، مگر اکثر و بیشتر عوام تو عوام خود بہت سے ''اہل علم'' بھی اس طرح دور بھاگ رہے ہیں، گویا کہ یہ کوئی آسیب یا ''غیر اسلامی'' چیز ہو۔ کیا یہ ایک عجیب بات نہیں ہے کہ حاملین قرآن خود اپنی ہی کتاب کی اس ''نئ تجلّی'' کے مشاہدے کی تاب نہیں لا رہے ہیں؟ مگر اب اُن کو

خواہی یا نا خواہی قرآن کا یہ جلوہ دیکھنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ بندہ نے اس سلسلے میں اتنے وزنی دلائل اکھٹا کردئے ہیں، جن سے انکار ممکن نہیں ہوگا۔ میرا اشارہ اپنی نئی کتاب ''قرآن عظیم کا نظام دلائل اور ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ'' کی طرف ہے۔ اوراس کتاب کے ملاحظے سے قرآن کی حجت خود حاملین قرآن پر پوری ہوجائے گی اوراُن کے لئے اس ''کڑوے پیالے'' کو پینے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جائے گا۔

بہر حال راقم نے اب تک جتنا بھی علمی کام کیا ہے وہ بہت کافی ہے، جواس راہ میں جدوجہد کرنے والوں کے لئے ایک گائیڈ کا سا کام کرے گا۔ اس طرح انتھک جدوجہد کے بعد میری زندگی کا مشن پورا ہوچکا ہے۔ اوراب میں داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کے لئے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔ اگر ملت نے اس کام کی اہمیت پہچان کر میرا ساتھ دیا ہوتا تو یہ راستہ بہت تیزی سے طے کرسکتا تھا۔ مگر خدا کی مصلحتیں خدا ہی جانے۔

ایک عظیم خدائی نعمت

فرقانیہ اکیڈمی ہمیشہ اسم بامُسمّیٰ رہی، جیسا کہ میری ہر تصنیف اس کی شاہد عدل ہے۔ قرآن ہی کی راہ میں جیتے رہےاور قرآن ہی کی راہ میں مر رہے ہیں۔ اورخدا سے یہی دعا ہے کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس ''نشے'' کو قائم ودائم رکھے۔ زندگی کے ہر پہلو پر قرآنی حقائق ومعارف اُجاگر کرنے کے لئے ہمیشہ گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہوں۔ اور جب میں کسی مسئلے پر لکھنے بیٹھتا ہوں تو اکثر وبیشتر ایسے عجیب وغریب حقائق میرے نوک قلم پر آجاتے ہیں، جو پہلے میرے ذہن ودماغ میں نہیں ہوتے ہیں۔ اوراس پر خود مجھے حیرت ہونے لگتی ہےاور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی ان دیکھی قوت مجھ سے لکھوا رہی ہے۔ اور ایسے مواقع پر میرے جسم کی رگیں پھول جاتی ہیں اور پورے جسم میں ایک عجیب قسم کا اعصابی تناؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ تب مجھے

قرآن اور حدیث کے بعض نکات پر اچانک تنبّہ ہوتا ہے اور ذہن ہی ذہن میں ان کڑیوں کو ملاتے ہوئے ایک قلیل وقفے میں بیٹھے بیٹھے انہیں مرتب کر کے ایک بحث کی شکل میں پیش کر دیتا ہوں۔ اور ایسے مواقع پر محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر سے کوئی چشمہ اُبل رہا ہے۔ تب بندہ پورے جوش وخروش کے ساتھ اپنے ان ''تاثرات'' کو زوردار الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور الفاظ واسالیب میرے ذہن میں ایک سیل رواں کی طرح صف باندھے کھڑے ہو جاتے ہیں جن میں کچھ کو میں منتخب کر کے انہیں مرتب کرتا ہوں۔ **ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء.**

اس بیان کو میری خودستائی پر ہرگز محمول نہ کیا جائے۔ بلکہ یہ بات ﴿فَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ﴾ کے مطابق مرنے سے پہلے لوگوں کو بتا رہا ہوں۔ ورنہ میں نے اس قسم کی کوئی بات اپنی زندگی میں کبھی کسی کو نہیں بتائی۔ اگر چہ یہ ایک خالص خدائی نعمت ہے، لیکن اس نعمت تک پہنچانے اور میرے اندر قرآنی ''جوش وجذبہ'' بیدار کرنے کی راہ میں میری والدۂ محترمہ کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے، جنہوں نے عالم طفلی میں قرآن کی ''اذاں'' میرے کان میں ڈال کر میرے اندر قرآن کی رُوح بھر دی تھی۔ بلکہ دراصل قرآن کو میری گھٹی میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کہانی کی تفصیلات اس کتاب کے آخر میں درج کروں گا۔ چنانچہ آج اس راہ میں بندہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ سب میری والدہ کا صدقہ اور اُن کی دعاؤں کا اثر ہے۔

بعض نئے تفسیری اصول

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے، اور بعض لوگوں نے یہ سوال اُٹھایا بھی ہے کہ کیا اس طرح کی ''آزادانہ تفسیر'' کرنا جائز ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن اور حدیث کے ابدی نصوص اور اُن کی تصریحات کی بنا پر یہ بات بالکل جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے، جب کہ یہ

چیز محض اپنی خواہشات نفس کے باعث نہیں بلکہ صحیح تفسیری اُصولوں کے تحت اور قرآنی حقائق ومعارف کو اُجاگر کرنے کی غرض سے ہو۔ اور اس مقصد کے لئے خود قرآن اور حدیث نہ صرف رہنمائی کرتے ہیں بلکہ اس پر اُبھارتے بھی ہیں۔ نیز اس کے علاوہ خود قدیم مفسرین اور علماء حق کی تحریروں سے بھی نہ صرف اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ خود ائمہ سابقین ہی نے اس کی راہ بھی دکھائی ہے، خاص کر امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور امام ابن تیمیہؒ کے افکار اور اُن کی تحقیقات میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ لہذا یہ کوئی ''بدعت'' یا ''ناموس چیز'' نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں راقم کا طریقہء کار ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اپنی تحقیقات یا ''نئی باتیں'' پیش کرنے سے پہلے قدیم مفسرین کے اقوال و آراء کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ اگر کوئی چیز مجھے اپنی تحقیق کے مطابق معلوم ہوتی ہے تو اسے بطور ''تائید'' پیش کرتا ہوں، مگر ان پر تنقید وتعریض کبھی نہیں کرتا۔ کیونکہ جدید علوم کے تعلق سے ہمیشہ قرآن کے نئے نئے اسرار و رُموز سامنے آتے رہتے ہیں۔ لہذا قدیم مفسرین کو اس سلسلے میں ''کوسنا'' گویا کہ اپنی ہی جہالت کا ثبوت دینا ہے، جیسا کہ بعض متجددین یا بعض ''روشن فکر'' حلقوں کا زعم ہے۔ اور ایسے لوگ اکثر و بیشتر دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ قرآن کو اب تک کسی نے سمجھا ہی نہیں ہے۔ یہ ایک خطرناک روش ہے جو اہل اسلام کو سلف صالحین سے کاٹنے کی کوشش ہے، بلکہ یہ چیز قرآن کی حقیقت سے ناواقفیت کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ مگر الحمدللہ بندہ نے کبھی اس قسم کا ارتکاب نہیں کیا۔ بلکہ وہ اکثر و بیشتر قدیم مفسرین کی جانب سے معقول عذر پیش کرنے اور قدیم وجدید میں تطبیق دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس طرح بندہ پورے ذخیرۂ تفسیر کو پیش نظر رکھتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم بات بیان کرنے کی یہ ہے کہ ہمارے ذخیرۂ تفسیر پر ایک نظر ڈالی جائے تو اس میں ہمیں مختلف اقوال و آراء کا ایک ''ڈھیر'' نظر آئے گا، جو ظاہر بینوں کے لئے ایک اچھا خاصہ جنگل نظر آتا ہے۔ مگر ان ''بھول بھلیوں'' میں ایک بہت بڑی اور گہری حکمت بھی

کارفرما نظر آتی ہے، تاکہ ان کے ذریعہ جہاں ایک طرف اہل علم ونظر کی فکر کو ہمیشہ مصروف رکھتے ہوئے انہیں اصل حقیقت کا پتہ لگانے پر اُبھارا جائے تو دوسری طرف تحقیقی کام کرنے والوں کو اس ''اختلاف آراء'' سے مدد بھی مل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر، حدیث اور فقہ میں ہر جگہ ''اختلاف'' نظر آتا ہے، تاکہ اہل علم ونظر پر عقلی جمود کبھی طاری نہ ہوسکے، بلکہ وہ ہمیشہ غور وخوض اور تحقیق وتدقیق کے میدان میں آگے بڑھتے رہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں تفسیر ابن جریر، تفسیر کبیر، تفسیر ابن جوزی اور تفسیر ماوردی وغیرہ میں اختلافی اقوال وآراء کا ایک پورا ذخیرہ موجود ہے۔ ہمارے استاد تفسیر مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کو تفسیر ابن جریر پیش نظر رکھنی چاہئے، کیونکہ اس میں اتنے اقوال مل جاتے ہیں کہ کسی کو سلف سے انحراف کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ مگر عبرت کی بات ہے کہ ہمارے ذخیرۂ تفسیر میں اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بعض ''اہل علم'' کسی ''نئی تفسیر'' کو دیکھ کر بالکل بدک جاتے ہیں اور آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً یہ اعتراض ٹھونک دیتے ہیں کہ یہ ''دین میں نئی بات'' ہے۔ حالانکہ خود قرآن اور حدیث اس قسم کی ''نئی باتوں'' سے بھرے ہوئے ہیں۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يَا اُوْلِیْ الْاَبْصَارِ.﴾

غرض راقم نے اپنی تصنیفات میں جابجا قرآن اور حدیث کے ان حقائق ومعارف پر بحث کرتے ہوئے قدیم اور جدید میں تطبیق دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ اور اس سلسلے کے نئے نئے تفسیری اُصول بھی بیان کئے ہیں۔ مگر یہ چیز تقلیدی ذہن رکھنے والوں کے دماغ میں کسی بھی طرح نہیں گھستی۔

تفسیر بالرائے کی حقیقت

جہاں تک ''رأی'' کے ذریعہ قرآن کی تفسیر کرنے کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ بغیر علم صحیح کے محض رائے زنی یا خیال آرائی پر مبنی نہ ہو۔ بلکہ صحیح تفسیری اُصولوں کے تحت ہو،

خواہ وہ سابقہ مفسرین سے ہٹ کر ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ قرآن اور حدیث میں غور کرنے اور ان سے نئے مسائل میں رجوع کرنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں قرآن اور حدیث دونوں ''معطّل'' ہو کر رہ جائیں گے، اور اُن کا مصرف صرف ''تلاوت'' بن کر رہ جائے گا۔ حالانکہ وہ دونوں علم و حکمت کے بحرِ زخار ہیں، جن کے معارف کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

غرض ترمذی میں ''تفسیر بالرائ'' کے سلسلے میں تین حدیثیں مذکور ہیں: ان میں سے پہلی حدیث یہ ہے کہ ''جس نے قرآن میں بغیر علم کے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ کو بنالے''۔ دوسری حدیث میں ہے کہ ''جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ کو بنالے''۔ اور تیسری حدیث میں ہے کہ ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور اُس نے صحیح بات بھی کہی تو بھی وہ غلطی پر ہے''، (دیکھئے کتاب تفسیر القرآن)۔ تو ان تینوں حدیثوں کا حاصل یہ ہوا کہ بغیر علم (یا صحیح اُصولوں) کے محض اپنی ذاتی رائے کی بنا پر قرآن کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ اسی وجہ سے پہلی حدیث میں ''علم'' کی قید لگائی گئی ہے۔ اور بعض دیگر حدیثوں میں مذکور ہے کہ ''قرآن کے عجائب کبھی ختم نہیں ہو سکتے'' (ترمذی)۔ اس طرح کی اور بھی حدیثیں موجود ہیں، جن کے مطابق قرآن حکیم میں غور و خوض کر کے اُس کے رُموز و اَسرار واضح کرنے کی تاکید و تلقین کی گئی ہے۔ جب دنیائے اسلام میں عقلی نقطۂ نظر سے جو تفسیریں لکھی گئیں وہ سب اسی اُصول کے مطابق ہیں، جیسے تفسیر کشاف، تفسیر بیضاوی اور تفسیر کبیر وغیرہ۔ اور اس سلسلے میں تفسیر کبیر تو شرعی و عقلی مسائل و مباحث پر مشتمل ایسی لاجواب اور شاہکار تفسیر ہے جو پورے ذخیرۂ تفسیر پر بھاری ہے۔ چنانچہ بعض علماء کا قول ہے کہ اگر امام رازیؒ نے یہ تفسیر نہ لکھی ہوتی تو اسلام کے معقولیت پسند علماء گمراہ ہو جاتے۔ غرض اس تفسیر میں بعض ایسے سائنسی حقائق بھی موجود ہیں جو تحقیقات جدیدہ کے عین مطابق ہیں۔ اور یہ حقائق اُس دور کی مسلم تحقیقات کا

نتیجہ ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک معرکۃ الآ راء تفسیر ہے۔ لہٰذا موجودہ دور کے علماء اگر جدید سائنس سے ناواقف ہیں تو اُنہوں نے ہمارے ذخیرۂ تفسیر ہی کا مطالعہ کب کیا ہے؟ کیا یہ ایک عبرت انگیز بات نہیں ہے؟ یہ تفسیر ساتویں صدی ہجری کی ابتداء میں مکمل ہوئی تھی تب سے یہ علمی حلقوں میں بہت مشہور و مقبول ہے۔

ایک حدیث کے مطابق یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ اسلام کا آغاز جس طرح اجنبی ماحول میں ہوا تھا اسی طرح وہ دوبارہ اجنبی بن جائے گا۔ چنانچہ آج یہ نظارہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ عوام تو خیر ''کالأ نعام'' ہیں ہی، مگر خواص اُمت کا کیا حال ہے؟ اور اُن کا ''علمی معیار'' کیا ہے؟ تو راقم الحروف کو انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ خواص اُمت کا مطالعۂ قرآن بھی کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے، سوائے چند گنے چنے علماء کے، جو خال خال طور پر نظر آتے ہیں۔ مگر وہ بھی عموماً نئے علوم اور نئے مسائل کی باتیں سن کر ''تردّد'' میں پڑجاتے ہیں کہ ان باتوں کی تصدیق کی جائے یا نہیں؟ چنانچہ اس سلسلے میں بعض چوٹی کے علماء کے بارے میں مجھے جو تجربہ ہوا اُس کی بنا پر میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔ مگر میں اس موقع پر اُن کا نام لینا ہرگز گوارہ نہیں کروں گا۔

اس قسم کے تذبذب کی اصل وجہ وہی ہے کہ اہل علم سائنسی علوم اور ان کی حقیقت و ماہیت سے لاتعلق ہیں ہی، مگر اس سلسلے میں دوسری مصیبت یہ ہے کہ اُن کا قرآنی مطالعہ عمومی اعتبار سے بالکل سطحی ہے، **الاّ ماشاء الله** ۔لیکن جب تک ان دونوں گھاٹیوں کو عبور نہیں کرلیا جاتا قرآن عظیم کے رُموز و اسرار کھل نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے فرقانیہ اکیڈمی کے قیام کے بعد جب میں نے قلمی میدان میں قدم رکھا تو مجھے بہت جلد احساس ہوگیا کہ عوام سے بڑھ کر اہل علم کی ذہن سازی ضروری ہے۔ اگرچہ بہت سے روشن فکر علماء نے میری علمی تحقیقات کی دل کھول کر داد دی اور میری کاوشوں کو ضرور سراہا، مگر مجموعی اعتبار سے علمی حلقوں میں بڑی سردمُہری دکھائی دی۔ اور

یہ صورت حال اب بھی برابر جاری ہے۔ چنانچہ بعض علمی حلقے عوام کو بڑی سادگی کے ساتھ یہ ''مشورہ'' دیتے ہیں کہ قرآن ''کتاب ہدایت'' ہے، لہذا اُسے سائنسی علوم سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ علوم ومسائل بدلتے رہتے ہیں۔ حالانکہ ان علوم کی حقیقت کچھ اور ہی ہے، جوان کی تحصیل کے بغیر واضح نہیں ہوسکتی۔ اہل علم کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی غرض سے میں نے اپنی تصنیفات میں جابجا اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ مگر یہ غلط فہمی اب تک برقرار ہے۔ لہذا اب اس سلسلے میں مجھے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی وہ بات یاد آتی ہے، جس کے مطابق اُنہوں نے کہا تھا:

﴿ يَا شُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ. ﴾ (ھود: ۹۱)

ترجمہ: اے شعیب جو کچھ تم کہہ رہے اُس کی اکثر باتیں ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔

اس موقع پر علامہ اقبال کا ایک شعر بھی یاد آ رہا ہے:

جب تک تیرے ضمیر پر نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے رازی نہ صاحب کشاف

قدیم فلسفہ اور جدید سائنس

غرض جب راقم علمی دنیا میں نیا نیا وارد ہوا تو مجھے پوری اُمید تھی کہ علمی حلقے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور پھر اس کے نتیجے میں مدارس میں سائنسی علوم کی تعلیم وتدریس پھر سے شروع ہوجائے گی، جس طرح کہ قرون وسطی کے مسلم دور میں وہ رائج تھے۔ اور اُس وقت اہل اسلام نے دو قسم کے مدرسے نہیں بنائے تھے۔ بلکہ شرعی علوم کے ساتھ عقلی علوم کی بھی تعلیم ہوا کرتی تھی۔ اور اُس دور کے عقلی علوم میں سائنسی علوم کی تعلیم بھی شامل تھی۔ کیونکہ اُس دور کے فلسفے میں یہ تمام علوم خلط ملط تھے۔ چنانچہ اُس دور کی طبعیات اور فلکیات آج بھی عربی مدارس میں رائج ہیں۔ مگر

یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ قدیم سائنسی علوم کے برعکس جدید سائنسی علوم سے اجتناب کی وجہ کیا ہے؟ جب کہ آج سائنسی علوم پوری طرح نکھر کر اپنے شباب پر پہنچ گئے ہیں۔ اس طرح قدیم سائنس میں جو نقائص پائے جاتے تھے وہ دور ہو چکے ہیں۔ چنانچہ جدید سائنس کا کمال یہ ہے کہ اُس کی تحقیقات کی وجہ سے جہاں ایک طرف قرآن کا علمی اعجاز ثابت ہو رہا ہے تو دوسری طرف یہ علم قدیم فلسفے کی طرح محض نظریاتی نہیں بلکہ تجرباتی بن گیا ہے، جس کی وجہ سے آج تسخیر کائنات عمل میں آ رہی ہے۔ کیونکہ جدید سائنس نے نظام فطرت کے وہ مخفی راز دریافت کر لئے ہیں جن کی بنا پر مادی قوتوں سے لیس ہو کر کچھ قومیں کمزور قوموں پر تسلط حاصل کر رہی ہیں۔ اور اس میدان میں عالم اسلام بھی محفوظ نہیں ہے۔ مگر افسوس اور حیرت کا مقام ہے کہ آج کل کے مسلمان دینی و دنیوی دونوں حیثیتوں سے اس مفید علم سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے اب تک "جزء لا یتجزیٰ"، "مقولات عشر" اور "افلاک سبعة" سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ یا للعجب! اس موقع پر ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر سائنسی علوم کا اسلام اور قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر منطق و فلسفے سے ان کا کیا تعلق ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ موقف سوائے ہٹ دھرمی کے اور کچھ نہیں ہے۔ زمانے کا مزاج ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔ لہذا جو قوم زمانے کے مزاج سے ناآشنا ہو کر اپنی پرانی ڈگر ہی پر چلتی رہے گی وہ ہمیشہ مار کھاتی رہے گی۔

لہذا اب عربی مدارس یا تو اپنا نصاب تعلیم بدلیں یا پھر بے موت مرنے کے لئے تیار رہیں۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔

عوام کی علم بیزاری

میں بھی اپنی داستان عبرت سناتے سناتے کہاں سے کہاں پہنچ گیا! مگر جب بات میں

بات نکلتی ہے تو میں اپنے قلم کو کسی بھی طرح روک نہیں سکتا۔ بلکہ وہ اکثر و بیشتر بے قابو ہو جاتا ہے۔

غرض جب راقم الحروف نے ماہنامہ تعمیر فکر نکالنا شروع کیا تو شہر کے پڑھے لکھے یا ''سمجھدار'' قسم کے لوگوں سے ملنے کے لئے چلا جاتا اور ان سے مل کر اکیڈمی اور رسالے کا تعارف کراتے ہوئے اپنی قرآنی فکر و تحقیق کے بارے میں بتاتا۔ مگر اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ عوام (اگرچہ وہ پڑھے لکھے ہی کیوں نہ ہوں) قرآن کے بارے میں ''نئی نئی'' باتیں سننے کے عادی نہیں تھے۔ سوائے چند گنے چنے افراد کے۔ ظاہر ہے کہ جب خواص ہی عادی نہ ہوں تو یہ شعور عوام میں کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی بعض لوگ از راہ ہمدردی کچھ امداد کر دیا کرتے تھے۔ مگر جب تعمیر فکر کا دوسرا سال شروع ہوا تو اکثر و بیشتر قارئین (خریداروں) نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اس سے بڑی بد دلی پیدا ہوئی۔ کیونکہ عوام نے میری باتوں کو یا تو نہیں سمجھا یا اُنہوں نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ بعض لوگوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم کاروباری لوگ ہیں، لہٰذا ان باتوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ہمارے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اس پر بندہ جب علم دین کی دُہائی دیتے ہوئے کہتا کہ اس خدمت میں، ہم کو کافی مالی نقصان اُٹھانا پڑ رہا ہے لہٰذا کچھ مدد ہی کی خاطر خریدار بنئے یا کچھ مالی امداد کیجئے، تو ایک صاحب نے پھٹ سے جواب دیا کہ پھر تو آپ کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کر لیتے۔ اس قسم کے جوابات سُن کر بد دلی کی انتہاء ہو جاتی۔ لیکن پھر بھی صبر کرتے ہوئے اس راہ میں مشقتیں برداشت کرتے رہے۔

اس دوران ایک دوسرا کام یہ کیا کہ مختلف کالجوں کے طلبہ کو عربی زبان سکھانے کا ارادہ کر کے ہفتہ واری پروگرام شروع کئے۔ تاکہ کالجوں کے طلبہ کو اپنی تحریک سے روشناس کرا کے ان میں بیداری لائی جائے۔ اُس وقت اکیڈمی شہر کے ''جالی محلے'' میں تھی اور یہاں سے قریب ہی شہر کا مشہور ''مسلم ہاسٹل'' واقع تھا۔ جہاں پر کالجوں کے طلبہ مقیم تھے۔ چنانچہ میری تحریک پر دس

پندرہ طلبہ ہر اتوار کو اکیڈمی آجایا کرتے تھے۔ اور میں ایک نئے اور آسان طریقے سے انہیں عربی سکھاتا تھا، جس میں گرامر کم سے کم اور بات چیت زیادہ ہوتی تھی۔ مگر یہ سلسلہ چار چھ مہینوں سے زیادہ چل نہ سکا۔ کیونکہ اس دوران کثرت کار کی بنا پر میری طبیعت تھک کر چور چور ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ طلبہ میں بھی رفتہ رفتہ شوق کم ہوتا گیا۔

جیسا کہ پچھلے صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ مسلسل اور انتھک جدوجہد کرتے کرتے جب میرا دماغ آؤٹ ہو چکا تھا اور پھر مزید یہ کہ قوم کی ناقدری کی وجہ سے بددلی ہی نہیں بلکہ مایوسی پیدا ہو گئی تھی تو رسالہ بند کر کے کئی ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ مگر اس دوران کسی نے پوچھا تک نہیں کہ آپ زندہ ہیں یا مر گئے؟

غرض تعمیر فکر نکال کر عوام کی ذہنیت اور اُن کی نفسیات کو سمجھنے بلکہ اُن کا سروے کرنے کا اچھا موقع ملا، جو میری بعد کی زندگی میں بہت کام آیا۔ اور اس دوران بہت سے قیمتی تجربات حاصل ہوئے۔ مگر ان تمام کی تفصیل غیر ضروری ہے۔

ملت کا ذہنی افلاس

اکیڈمی جب قائم ہوئی تو اخلاقی طور پر میری ہمت افزائی کرنے والے شروع میں میرے دو دوست تھے: مولانا عبداللہ باشاہ ندوی مرحوم اور عبدالرشید مرحوم۔ پھر اس کے بعد بعض احباب کے مشورے سے شہر کے بعض سربرآوردہ علماء اور عمائدین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی، جو مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ہم دوستوں کا خیال یہ تھا کہ مختلف الخیال افراد کو اکھٹا کر کے اتحاد ملت کی راہ بھی ہموار کی جائے۔ اور پھر ہمارا کام بھی ایک خالص علمی و تحقیقی کام تھا، جس سے کسی بھی طبقے کو انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ہمیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ بھانت بھانت کے لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی مدت میں اندرونی

اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ اور پھر ایک دوسری تلخ حقیقت جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ بعض نے مجھے ہی ''خورد'' سمجھ کر حکم چلانا شروع کر دیا اور اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اُن کی ناز برداریاں کرنی پڑیں۔ اسی طرح بعض اراکین مجھے اور تعمیر فکر کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش بھی کرنے لگے۔ ہم کو اُمید تو یہ تھی کہ مختلف الخیال لوگ قرآن کی دعوت اور اُس کی تحریک پر اکھٹا ہو جائیں گے اور ایک مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آ جائے گا۔ مگر یہ سب ایک سراب سا دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں کو قرآن اور اسلام سے زیادہ محض اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی زیادہ فکر تھی۔ اور اس کی ایک واضح مثال یہ تھی کہ بعض لوگ ناچیز کی تحریری ''قوت و کشش'' سے اس قدر مسحور تھے کہ اُنہوں نے میری مجبوریوں (مالی دشواریوں) کے پیش نظر مجھے ایک بھونڈا سا مشورہ یہ دیا اور اچھی تنخواہ کا لالچ بھی دیا کہ آپ ہمارے مدرسے سے وابستہ ہو جایئے ہم ایک شعبۂ تصنیف قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ موضوع کیا ہوگا؟ تو اُنہوں نے کہا کہ ہمارے مدرسے کی تاریخ اور ہمارے ''حضرت'' کی سیرت لکھنی ہے، **لاحول ولا قوۃ إلا اللہ.** یعنی ایک آفاقی شخص جو قرآنی فکر سے سرشار ہے اُسے اس طرح زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس سے ہماری ملت کے ذہنی افلاس کا اندازہ ہوا کہ ایک مدرسے کے ذمہ دار کو قرآن سے زیادہ صرف مدرسے کی فکر رہتی ہے۔ **فاعتبروا.**

بہر حال ان پے در پے دشواریوں اور ناکامیوں سے طبیعت ہمیشہ مُکدّر رہی اور ذہنی کش مکش کا ایک عجیب عالم رہا۔ ایک قدم آگے بڑھتا تو دوسرا قدم پیچھے ہو جاتا۔ رسالہ الگ گھاٹے میں چل رہا تھا۔ تعمیر فکر کو بند کرنے کے یہ بھی چند اسباب تھے۔ غرض یہ دور میرے لئے نہایت درجہ ہمت شکن اور روح فرسا ثابت ہوا۔ پھر سفر حج کے بعد اکیڈمی میں نئی جان آئی، جس کا حال اوپر گزر چکا ہے۔ اس دور کو یاد کر کے آج بھی ایک قسم کی پژمردگی طاری ہو جاتی ہے۔

چند سال کے بعد یہ کمیٹی تحلیل ہوگئی۔ مگر بعض لوگ جو اکیڈمی کی مالی امداد کرتے تھے وہ اکیڈمی کو میری ذاتی ملکیت تصور کرتے ہوئے حساب مانگتے اور اسے رجسٹر کرانے کا تقاضہ کرتے رہے۔ اس طرح ایک نئی افتاد آن پڑی۔ مگر ہمارے سامنے شہر کے بعض اداروں کی مثال موجود تھی جہاں پر دال جوتیوں میں بٹتی تھی۔ یعنی کمیٹی کے لوگوں میں گالی گلوچ تک کی نوبت آجاتی تھی۔ لہذا انجانے قسم کے لوگوں کو لے کر ٹرسٹ بنانا ایک بہت بڑا جوکھم اُٹھانا بلکہ خود کو آگ میں جھونکنے کے برابر تھا۔ اور پھر ایسی حالت میں جب کہ علمی کام سکون اور یکسوئی کا طالب ہے۔ اسی دوران اپنے دونوں دوست اللہ کو پیارے ہوگئے۔ تو بندہ یکہ وتنہا ہو کر رہ گیا۔ پھر کافی سوچ بچار کے بعد ۱۹۸۵ء میں پانچ افراد پر مشتمل ٹرسٹ بنایا گیا تو ایک دوسرا تماشا رونما ہوا اور بعض ٹرسٹیوں نے میری ''جڑوں'' کو کھودنا شروع کر دیا۔ ان کی اس حرکت سے بڑا صدمہ ہوا اور بڑی مشکل سے اُن سے چھٹکارا حاصل کیا۔ پھر اُس کے بعد خوش قسمتی سے ایک نہایت درجہ موزون اور مخلص شخص مل گئے جن کا نام ڈاکٹر بشیر احمد رازی ہے۔ وہ تقریباً آٹھ نو سال تک اکیڈمی کے ٹرسٹی رہے۔ مگر ۱۹۹۸ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اپنے سابقہ تجربات کے بعد اس بارے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا ہے۔ پتہ نہیں انجانے لوگوں کی وجہ سے کب کیا نوبت آجائے۔

اس پورے عرصے میں ہماری ملت کا نیچے سے لے کر اوپر تک ایک مکمل سروے کرنے کا ایک نادر موقع مل گیا، جو اس اُمت کے ذہنی افلاس کی ایک مُنہ بولتی تصویر ہے۔ اور یہ صورت حال ﴿كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ (ہر ایک اپنی اپنی کھال میں مست ہے) کی ایک زندہ تفسیر ہے۔

ٹرسٹوں کی حقیقت

ٹرسٹوں کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ٹرسٹ محض ایک دکھاوا ہوتا ہے، جو عوام کو مطمئن

کرنے کی غرض سے ہوتا ہے۔ اوراس میں ٹرسٹیوں کی حیثیت عموماً برائے نام ہوتی ہے، جب کہ کام کرنے والا صرف ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔ کیونکہ جب کسی وجہ سے ٹرسٹیوں میں اختلاف پیدا ہوجائے تو کام کرنے والے کے لئے کام کرنا اور اپنے مشن کو جاری رکھنا دشوار ہی نہیں بلکہ بعض حالات میں ناممکن ہوجاتا ہے۔ اسی وجہ سے بندہ ٹرسٹ بنانے میں ہمیشہ ہچکچاتا رہا۔ مگر جب ٹرسٹ بنا کر اُس کا حشر دیکھ لیا تو اب کسی نئے آدمی کو لینے میں انجانے قسم کے اندیشے لاحق رہتے ہیں۔ اگر کسی ''بڑے'' آدمی کو لیا جائے تو وہ ہم پر حاکم بن جائے گا اور اگر کسی ''چھوٹے'' آدمی کو لیا تو وہ حسد میں مبتلا ہوجائے گا یا کم از کم ہماری ٹوہ میں لگ جائے گا۔ یہ ایک ایسی کربناک حقیقت ہے جس کا اندازہ ایک عام آدمی کو کسی بھی طرح ہو نہیں سکتا، جب تک کہ وہ خود اس کا تجربہ نہ کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کسی اور کو ٹرسٹ میں بھرتی کرنے کی ہمت ہی نہیں ہورہی ہے، پتہ نہیں کہ کونسی نئی آفت آجائے۔ محنت ہم کریں اور حکومت کوئی اور کرے۔ اس اعتبار سے ٹرسٹوں کی قدر و قیمت میری نظر میں بالکل مشکوک ہے۔ اور بعض قومی و ملی ٹرسٹوں میں ٹرسٹیوں کی آپس میں جو رقابت اور چپقلش ہوتی ہے، جہاں پر گالی گلوج تک کی نوبت آجاتی ہے، وہ بھی میرے سامنے ہے۔ علمی اداروں کو اس قسم کے ہنگاموں سے ہمیشہ دور رہنا چاہئے۔ ورنہ علمی کام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے لئے سکون اور یکسوئی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مگر یہ بات عوام کی سمجھ میں کسی بھی طرح نہیں آسکتی۔ وہ تو یہی دیکھتے ہیں کہ کوئی ادارہ ''فردی'' ہے یا ٹرسٹ ہے؟ اگر ٹرسٹ نہیں ہے تو یہی سمجھتے ہیں کہ اس ادارے میں ''من مانی'' ہوتی ہے۔ حالانکہ ٹرسٹوں میں بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر ''ٹرسٹ'' کے نام کی وجہ سے لوگ مرعوب ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ اس کی حقیقت ایک ''شو'' سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بہر حال اگر بندہ اپنے ٹرسٹ میں کچھ بڑے آدمیوں کو لے کر اُنہیں اپنے آپ پر مسلط کرلیتا تو میں نے علمی و تحقیقی میدان میں جو کام

''آزادانہ'' طور پر کیا ہے وہ ہرگز وجود میں نہیں آ سکتا تھا۔

فرقانیہ اکیڈمی ایک مثالی مرکز

اور پھر یہ ادارہ اگر کسی دوسرے کے ماتحت ہوتا تو اپنی ''فکر'' پر ''لگام'' لگ جاتی اور وہ انقلابی کام کبھی وجود میں نہ آ سکتا تھا جو بندہ نے اس راہ میں کیا ہے۔ بہرحال بندہ اپنے کام پر بالکل مطمئن ہے کہ اُس نے پوری دیانت داری کے ساتھ کام کر کے اس اُمت کی بھلائی کے لئے وہ کام کیا جو بہت سے ادارے اور اکیڈمیاں بھی اب تک نہیں کر سکی ہیں۔

بہرحال فرقانیہ اکیڈمی اس وقت پورے برصغیر کا ایک بے مثال تحقیقی مرکز ہے جس کو قائم کرنے اور پروان چڑہانے کی راہ میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرتے ہوئے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ لوگ شاید یقین نہ کریں کہ بندہ ۱۹۶۲ء-۱۹۶۸ء کے عرصے میں اپنے مطالعہ و تحقیق کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتا تھا، جس میں اللہ نے خوب برکت دی تھی۔ اس کے نتیجے میں میں نے کئی زمینیں خریدیں اور ایک گھر بھی بنا کر اسے کرائے پر اُٹھا دیا تھا۔ جو اکیڈمی کے قیام کے بعد وہی میرا ذریعہ معاش تھا۔ پھر میں نے اپنی ایک زمین فروخت کر کے اپنی پہلی کتاب شائع کی تھی۔ اور اس میں اپنے دوست مولانا عبداللہ باشاہ ندوی نے بھی کچھ مالی مدد کی تھی۔ پھر اکیڈمی چلانے کی راہ میں میں نے اپنی تمام زمینیں اور مکان بھی فروخت کر دیا یہاں تک کہ اپنا آبائی مکان بھی بیچ ڈالا۔ اس وقت (۲۰۰۲ء) میں میرا کوئی ذاتی مکان تک نہیں ہے، بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ سب اکیڈمی کا ہے۔ ہاں البتہ ایک کھیت ضرور ہے جو مجھے میری والدہ کی جانب سے وراثت میں ملا ہے۔ میری طبیعت ہمیشہ سے قلندرانہ اور مزاج فقیرانہ قسم کا رہا ہے۔ دنیوی تکلفات سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس طرح اپنا سب کچھ

لُٹا کرایک شاندارادارہ بنایا ہے۔اور میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔اوراپنی پوری زندگی اس قرآنی آیت کریمہ کا مصداق رہی ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ. ﴾ (توبہ: ۱۱۱)

ترجمہ: اللہ نے اہل ایمان کے جانوں اوراُن کے مالوں کوخرید لیا ہے۔

لیکن بندہ کواس پرکوئی فخرنہیں ہے، بلکہ یہ سب کچھ اپنے مرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اوراُس کے احسانات کی شکرگزاری کے طور پر عرض کررہا ہے۔لہذا اسے کسی بھی طرح اپنی خودستائی پرمحمول نہ کیا جائے۔

ناقابل فراموش حقائق وواقعات

اگر چند گنے چنے صاحب فکر علماء نے میری قرآنی تحریک کی تائید نہ کی ہوتی اور چند اہل کرم حضرات نے میرا ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہ گلشن علم کبھی کا مرجھا کرختم ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ باریٔ تعالیٰ ہر مشکل موقع پر غیبی دروازے کھول دیتا، جس کی وجہ سے بندہ مختلف قسم کے ''خلاف علم'' طوفانوں سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی راہ میں ہمیشہ کامیاب رہا۔اور یہ جاہلی قسم کے طوفان ایسے سخت وشدید تھے کہ بسااوقات میرے جمے جمائے قدم اُکھاڑ دینا چاہتے تھے۔مگر ''پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا'' کے مطابق ہر مرتبہ طوفانی بھنوروں سے بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ بعض ملت فروشوں کی یہ داستان بڑی عبرتناک ہے۔مگر بندہ تفصیلات میں گئے بغیر صرف چند جھلکیاں اشاروں وکنایوں میں عرض کرنا چاہتا ہے۔

۱۔بعض مقامات پرفرقانیہ اکیڈمی کی ''ظاہری'' شان وشوکت کودیکھ کر جہلاء قسم کے حاسدوں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگا اور اُنہوں نے میرے خلاف پروپگنڈہ کرنے اور گندے قسم کے الزامات کا ایک سلسلہ شروع کردیا اور مجھے ایک ''عیاش'' قسم کا آدمی تک قرار دینے سے بھی

باز نہ آئے۔ اور اس راہ میں غیروں سے زیادہ اپنوں سے تکلیف پہنچی۔ دل آزاریوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا تو مجبوراً اس علاقے کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔

۲- شہر میں طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا اور بعض عجیب وغریب تجربات سامنے آئے، جن کی تفصیل میں جاؤں تو ایک اور کتاب وجود میں آجائے گی۔ مجموعی اعتبار سے یہاں پر لوگ کچھ سیکھنے سمجھنے کے لئے بہت کم مگر پریشان کرنے کے لئے زیادہ آتے تھے، اور وہ بھی طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر۔ اور اس دوران حاسدوں اور شر پسندوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جو فرقانیہ اکیڈمی کو ایک خاندانی ٹرسٹ قرار دے کر اصحاب خیر حضرات کے کان بھرا کرتے تھے۔

۳- اس دوران بعض ''تاریک سائے'' بھی اکیڈمی پر منڈلاتے رہے اور ان کی فکر یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح اکیڈمی ''اغوا'' کر کے اُسے اپنی تحویل میں لے لیا جائے اور پھر اپنے حقیر اغراض ومقاصد کے لئے مجھے ''بلیک میل'' کیا جائے۔ اور یہ سب کچھ اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے تھا، جس کا بھرپور استحصال کرنے کی کوشش ہی نہیں ایک بہت بڑی سازش رچائی گئی۔ اس واقعے سے مجھے اس قدر قلبی صدمہ پہنچا کہ اس ملت پر سے میرا اعتبار تقریباً اُٹھ گیا۔ اس سے پہلے بھی بعض لوگوں کی ''نظر بد'' اس ادارے پر تھی۔ مگر یہ سب سے زیادہ منظم اور بھیانک کوشش تھی۔ جس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں کہ کیا لوگ اس حد تک بھی جا سکتے ہیں؟

۴- موجودہ زمانہ صحیح معنی میں قحط الرجال کا دور ہے۔ کوئی اچھے اور باصلاحیت رفقائے کار کا دور دور تک کوئی وجود دکھائی نہیں دیتا۔ زیادہ تر لوگ اس میدان میں محض وقت گزاری یا پیسہ کمانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ اس بنا پر جتنے بھی افراد کو رفیق کار مقرر کیا سب ایک ایک کر کے چلتے بنے۔ چنانچہ بعض افراد مضمون نگاری کی مشق کرنے کے بعد کسی اچھی نوکری کی تلاش میں نکل

گئے تو کچھ افراد کمپیوٹر کی تربیت حاصل کر کے نو دو گیارہ ہو گئے۔اس سے مجھے بہت بڑا دھکا لگا۔

۵-آج کل علم کا معیار بالکل پست ہو گیا ہے۔اور یہ وبا آج خود ''عالم نما'' لوگوں میں بھی پھیل گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب خطیبوں کی کثرت اور دین کا صحیح علم رکھنے والوں (فقہاء) کی قلت ہو جائے گی۔ یہ پیش گوئی موجودہ دور پر پوری طرح صادق آ رہی ہے۔ چنانچہ آج ہر جگہ ''مقررین'' کی فوج کی فوج نظر آ رہی ہے، جو علم دین میں رُسوخ حاصل کرنا تو درکنار دین کا ''مزید'' مطالعہ کرنا ایک فعل عبث تصور کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہر طرح سے ''فارغ'' سمجھتے ہیں۔یعنی مدرسوں سے فارغ کیا ہوئے گویا کہ ''علم'' سے ہمیشہ کے لئے فارغ ہو گئے۔ حالانکہ مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ مطالعے کی استعداد پیدا کرنے کی غرض سے ہے۔ ورنہ علم تو ایک بحر نا پیدا کنار ہے۔اسی بنا پر راقم نے قرآن اور سائنس کے موضوع پر اکیڈمی کے تحت ماہانہ خطبات کا سلسلہ شروع کیا تا کہ خاص کر علماء کو مدعو کر کے ان کی ذہن سازی کی جائے۔ چنانچہ ہر خطبے کے لئے خصوصی طور پر دعوت نامے چھپوا کر منتخب علماء اور تعلیم یافتہ طبقے کو مدعو کیا جاتا تھا۔مگر میری حیرت کی کوئی انتہاء نہ رہی کہ علماء کے لئے یہ آواز یا تو غیر مانوس رہی یا پھر اُنہوں نے اس قسم کی باتیں سننے کو اپنی ''توہین'' پر محمول کر لیا۔ گویا کہ وہ پہلے ہی سے ''فارغ'' ہو چکے تھے۔اور یہی نہیں میں اپنے خطبات کا خلاصہ اخبارات میں بھی شائع کراتا تھا، تا کہ عام لوگوں کو بھی اس موضوع سے کچھ دلچسپی پیدا ہو اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی شک وشبہ ہو تو وہ مجھ سے رُجوع کرے۔ مگر مجھے ہر جگہ ایک پُر ہول سناٹے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔لیکن بندہ اب بھی مایوس نہیں ہوا ہے اور اپنے مشن کی تکمیل میں اب بھی پوری طرح جُٹا ہوا ہے۔اور اب ۲۰۰۲ء میں بھی ہندستان بھر کے اردو اخبارات میں چھوٹے چھوٹے مضامین شائع کرا رہا ہوں، اس اُمید پر کہ ہوسکتا ہے کہ چند ''باشعور'' قسم کے لوگ میری تحریک پر لبیک

کہتے ہوئے کارخلافت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوجائیں گے۔ ﴿وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ.﴾

۶- ہماری ملّت میں ''ابن الوقت'' قسم کے لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے، جو خود کو ملّت کے ''غم خوار'' ظاہر کرتے ہوئے محض اپنا اُلو سیدھا کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ ابن الوقت میرے ساتھ بھی لگے رہے اور ان کی متجسّس نگاہیں ہمیشہ میری جیب پر لگی رہتی تھیں۔ بندہ نے بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا۔ اسی طرح بعض لوگوں نے اکیڈمی کو مالی اعتبار سے بھی نقصان پہنچایا اور اس پر مقدمات تک کی نوبت آ گئی۔ قوم کے یہ ''جیب کترے'' اب ملّی اداروں کو بھی نہیں بخش رہے ہیں۔

۷- ملت کی نااہلی اور ناقدری کی بنا پر اپنی پوری زندگی ''ہجرتوں'' میں بسر ہوئی۔ اسے عوامی انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اپنی زندگی خانہ بدوشانہ قسم کی رہی۔ ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کوچ کرتے رہے۔ بلکہ پوری اکیڈمی اور اُس کی ''وزنی'' لائبریری کو بھی اپنے نازک کندھوں پر اُٹھائے گھومنا پڑا، کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ اس طرح یہ اکیڈمی اب تک متعدد مقامات پر چند دن کے لئے فروکش ہو کر ساتویں مرتبہ موجودہ مقام (بی ٹی ایم لے آؤٹ) میں پہنچی ہے، جو ہنگاموں سے دور ایک پوش اور پُرسکون علاقہ ہے۔

۸- اکیڈمی کے ان متعدد ''اسفار'' یا اُس کی ایک جگہ سے دوسری جگہ ''منتقلی'' کی بنا پر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ گویا عوام کو اکیڈمی سے واقف کرانے کی یہ ایک ''پریڈ'' یا ''نمائش'' تھی اور لوگ اسے ایک نمائشی چیز یا ایگزی بیشن سمجھ کر دیکھنے کے لئے آ جایا کرتے تھے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قوم مسلم کی ذہنیت کا کیا حال ہے؟ وہ قوم جو کبھی علم کے بامِ عروج پر تھی وہ آج ''علم'' کو ''حیرت'' سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے، بلکہ اُس کی ''روشنی'' سے بھی دور

بھاگ رہی ہے۔

۹- مجموعی اعتبار سے اس قسم کے علمی ادارے عوام کے لئے ایک معمے سے کم نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ علم کیا ہے اور کتاب کیا ہے؟ اکثر پڑھے لکھے مسلمان بھی اسلام کو صرف نماز روزے اور دعاؤں کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ اور عوام کی نظروں میں وہ ایک ''کراماتی'' قسم کا مذہب ہے۔ باقی دین و شریعت کے رُموز و اسرار کی باتیں ان کے لئے ایک عجوبہ معلوم ہوتی ہیں اور یہ باتیں اچھے اچھوں کے دماغوں میں نہیں گھستیں۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری قوم کے ''خطیبوں'' کی ہے، جنہوں نے عوام کو ''اُسطوری'' قسم کے قصے کہانیاں سنا سنا کر ان کا ذہن بگاڑ دیا ہے۔ اس بنا پر اب عوام کو دین کی صحیح بات بتانا اور ان کی اصلاح کرنا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ ایک کٹھن مسئلہ ہے۔ اور اس کے سب سے بڑے ذمہ دار ''خطیبان وقت'' ہیں، جو عوام کو دین سے ہٹانے کے درپے ہیں۔

۱۰- جب شہر کے مرکزی علاقے میں دارالشریعہ قائم ہوا جو ایک خالص تحقیقی و تصنیفی مرکز تھا تو بعض لوگ اپنے بعض ذاتی مسائل لے کر ہمارے پاس آنے لگے۔ اسی طرح بعض لوگ مالی امداد کے لئے اور بعض کسی درخواست پر تصدیق کرانے کی غرض سے بھی آجاتے تھے۔ اور اس سلسلے میں حد یہ تھی کہ کچھ لوگ خطوط، نکاح سر ٹیفکیٹ، اسناد اور تعارف نامے لے کر بھی آنے لگے کہ ہمیں ان کا عربی میں ترجمہ اور اس پر آپ کی تصدیق چاہیئے۔ اس طرح لوگوں نے ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ پڑھے لکھے لوگوں کی علمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض گریجویٹ قسم کے لوگوں کو لائبریری کا مطلب نہیں معلوم ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے ہماری لائبریری دیکھ کر پوچھا کہ آپ نے یہ سب کتابیں کہاں چھپوائیں؟

۱۱- کبھی کبھی ہندستان کے بعض بڑے شہروں کے دورے پر نکل جاتے اور وہاں کی

مشہور ہستیوں سے ملاقات کر کے ان کو اکیڈمی کے اغراض و مقاصد سمجھاتے تو بعض لوگ اس کام کو جماعتی یا مسلکی یا علاقائی ''عینک'' سے دیکھتے ہوئے امداد سے ٹال مٹول کیا کرتے تھے۔

۱۲- اکثر مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات کسی بھی طرح نہیں آتی تھی کہ اتنا بڑا ادارہ محض خدمت خلق اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ خالص ''خدمت'' کا تصور اُن کے لئے بالکل نیا اور اجنبی لگ رہا تھا۔ لہٰذا وہ اسے بھی ایک قسم کی تجارت ہی سمجھنے پر مجبور دکھائی دے رہے تھے، جس کے اغراض ''پوشیدہ'' ہوں۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کو میرے بارے میں ''تجسّس'' تھا تو بعض لوگوں کو فتنہ پروری کا شوق۔

۱۳- ہماری ملت کی نظر میں خیر کے کام عمومی طور پر صرف دو ہی دکھائی دیتے ہیں: ایک مسجد اور دوسرا مدرسہ۔ ان کے علاوہ کوئی تیسرا کام سمجھ میں نہیں آتا۔ مسجد یا مدرسہ کی ضرورت و اہمیت سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑی، مگر کسی تیسرے کام کی ضرورت سمجھانا ایک بہت ہی مشکل اور کٹھن کام ہے۔ اس بناء پر کسی علمی و تحقیقی کام کے لئے وسائل فراہم کرنا ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے سے کچھ کم نہیں ہے۔ کتابوں کو دیکھ کر بعض لوگ اسے ایک ''کاروباری'' چیز تصور کرتے ہیں تو بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ ''آپ کے مدرسے میں کتنے بچے پڑھ رہے ہیں؟'' جب اُن کو بتایا جاتا ہے کہ یہ مدرسہ نہیں بلکہ تصنیفی مرکز ہے تو وہ حیرت سے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اسی بنا پر اکیڈمی کو چلانے کے لئے اکثر و بیشتر ناکوں چنے چبانے پڑے۔

۱۴- دل آزاریوں کا یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا بلکہ بدستور جاری ہے۔ اور اب ایک نئے قسم کی آزمائش شروع ہوگئی ہے، جو میری زندگی کی سب سے کٹھن منزل ہے۔ چنانچہ ایک ''ابولہب'' قسم کا آدمی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے جو کمینہ پن پر اُتر آیا ہے۔ اللہ سے یہی اُمید ہے کہ وہ عنقریب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے اسے ابولہب ہی کی طرح عبرتناک

سزا دے گا۔

الغرض طرح طرح کے اور بھانت بھانت کے لوگوں سے میرا سابقہ رہا۔ اور اس طرح راقم نے اپنی قوم وملت کا ایک ''مکمل سروے'' کر لیا اور نیچے سے اوپر تک ہر ہر فرد کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیا ہے۔ اور ان کٹھن حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے چومکھی لڑائی لڑی ہے۔ مگر پھر بھی میں کبھی مایوس نہیں ہوا بلکہ قوم کو سمجھانے کے لئے نئے نئے راستے کھوج نکالنے ہی کی جدوجہد میں مصروف رہا کہ یہ قوم ''میری بات'' نہیں بلکہ ''قرآن کی بات'' سمجھ لے۔ مگر لوگ ہمیشہ قرآن کی بات کو میری بات سمجھ کر ٹالتے رہے۔ گویا کہ کوئی دیوانہ کچھ بک بک کر رہا ہے۔ اور یہ بات عوام سے زیادہ اکثر ''عالم نما'' لوگوں پر صادق آتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں یہ پیش گوئی موجود ہے کہ ''ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا''۔ یعنی لوگ اُس کے معانی ومطالب پر غور کرنا چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک کڑوی حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے ''خطبائے قوم'' قرآن اور حدیث کی باتیں لوگوں کو بتانے کے بجائے ایسی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن میں افسانوی قسم کے قصے اور خاص کر ''کرامات'' کا تذکرہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل قرآن اور حدیث کی باتیں عوام تو عوام خود خطبائے قوم کی بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔ بلکہ وہ قرآن اور حدیث کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ کیونکہ اُنہیں تو عوام کو قصے اور کرامات سنانے کی جو فکر رہتی ہے۔ اور اسی فکر میں وہ ہمیشہ غرق رہتے ہیں کہ اگلی جمعہ لوگوں کو کیا سنائیں؟ اور پھر قصے بھی ایسے جن کا کوئی سر پیر نہ ہو اور وہ بالکل افسانوی قسم کے ہوں۔ اس طرح آج عوام کو قرآن اور حدیث کے سوا باقی ''سب کچھ'' سنایا جارہا ہے۔ حالانکہ رسول اکرم صلعم نے صاف صاف فرمایا ہے کہ اگر تم قرآن اور حدیث کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہوسکو گے۔ اس اعتبار سے اب عوام سے زیادہ خواص کی اصلاح ضروری ہوگئی ہے۔ لہٰذا راقم

الحروف نہایت درجہ دلسوزی کے ساتھ رہبران ملت سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اب یا تو عوام کو ﴿یَـاأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا﴾: (اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور لوگوں سے سیدھی بات کہو) کے مطابق یا تو لوگوں کو سیدھی اور سچی بات بتائیں یا پھر اپنے منصب سے ہٹ جائیں۔ اس قوم کی تباہی بہت زیادہ ہو چکی ہے، لہذا اب اس پر رحم فرمائیں اور اپنے مقام و منصب کا غلط استعمال نہ کریں۔

بہر حال اُمت کی اس بے اعتنائی پر ہمیشہ کڑھتا رہا ہوں ﴿إِنَّـمَا اَشْکُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْ إِلـیٰ اللّٰہِ﴾ مگر "قہر درویش بر جان درویش" کے مطابق ہر مرتبہ اپنی ہی بوٹیاں نوچنے پر مجبور ہوتا رہا ہوں۔ اور اکثر و بیشتر خود کو بے یارو مددگار تصور کرتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں آہ و فغاں کرتا رہا ہوں۔

اس وقت میں اپنی عمر کی تہترویں منزل میں داخل ہو چکا ہوں اور میرے جسم کا ایک ایک عضو ایک پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے، سارے اعضاء ڈھیلے پڑ چکے ہیں، آنکھوں کی بینائی الگ زائل ہو رہی ہے، چار قدم چلتے ہوئے لڑکھڑا جاتا ہوں اور سر چکرانے لگتا ہے۔ اب میں آرام کرنا چاہتا ہوں، مگر آرام شاید میرے لئے "حرام" ہو گیا ہے۔ اب شاید قبر ہی میں مجھے آرام مل سکے گا۔ اب مجھے ایک ہی بات کی فکر ہے کہ میرے مسودات کو مکمل کون کرے گا؟ اور میرے بعد اس گلشن علمی کا کیا "حشر" ہو گا؟ کیونکہ وہ پوری قوم و ملت کے لئے ایک "عجائب گھر" کی حیثیت رکھتا ہے۔ تو کیا میرے بعد یہ اکیڈمی ایک میوزم میں تبدیل ہو جائے گی؟

مسلم پریس کا تعاون

ناسپاسی ہو گی اگر میں اس موقع پر اسلامی دنیا کے عربی، اردو اور انگریزی اخبارات و رسائل کا تذکرہ نہ کروں جنہوں نے میری اس قرآنی تحریک کا نہ صرف نہایت درجہ فراخ دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا بلکہ میری تحقیقات کو نمایاں طور پر شائع کر کے میرا پیغام عام کرنے میں بھی میری

بھر پور مدد کی۔ ان میں سب سے نمایاں کردار مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ہفتہ وار ''صدق جدید'' لکھنوء، مفتی عتیق الرحمان عثمانی کا ماہنامہ بُرہان دہلی، مولانا سمیع الحق حقانی کا ماہنامہ ''الحق'' اکوڑہ خٹک (پاکستان)، ندوۃ العلماء لکھنو سے نکلنے والا عربی ماہنامہ ''البعث الإسلامی''، دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ترجمان ''معارف''، رابطة العالم الإسلامی مکہ مکرمہ سے نکلنے والے عربی اخبار ''العالم الإسلامی'' اور رابطہ ہی کا انگریزی ماہنامہ ''دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل'' اور ماہنامہ ''اسلامک وائس''، بنگلور کا رہا ہے۔

نیز اس کے علاوہ اکیڈمی کے ابتدائی دور میں میرے بعض تحقیقی مضامین ماہنامہ ''فاران'' لندن، ماہنامہ ''المعارف'' لاہور، ماہنامہ ''فکر ونظر'' اسلام آباد، ماہنامہ ''بینات'' کراچی، ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی، ماہنامہ ''الفاروق'' کراچی، ہفت روزہ ''ندائے ملت'' لکھنو، پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ، ماہنامہ ''بانگ درا'' لکھنؤ اور ہفت روزہ ''نقیب'' پٹنہ کے علاوہ ہندستان بھر کے دیگر اردو روزناموں میں بھی شائع ہوتے رہے۔ جیسے روزنامہ اخبار مشرق کلکتہ، روزنامہ سالار بنگلور، ہفت روزہ نشیمن بنگلور، روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد، روزنامہ اردو ٹائمز بمبئ، روزنامہ انقلاب بمبئ، روزنامہ قومی آواز لکھنؤ، روزنامہ اخبار مشرق دہلی، روزنامہ آزاد ہند کلکتہ، روزنامہ منصف حیدرآباد، روزنامہ جنگ کراچی اور روزنامہ نوائے وقت کراچی وغیرہ وغیرہ۔ اور آج بھی میرے مضامین ان روزناموں میں مسلسل شائع ہورہے ہیں۔

میری بعض تحقیقات عرب میڈیا میں

اکیڈمی قائم ہونے کے بعد دس پندرہ سال تک صرف اردو ہی میں لکھتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے اردو حلقے کو بیدار کیا جائے۔ مگر جب یہاں پر سرد مہری صاف نظر آنے لگی تو عربی دنیا کو متوجہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ لہذا شروع شروع میں وقتاً فوقتاً مختصر مضامین لکھ کر رابطہ کے

عربی ہفتہ وار کو بھیجتے رہے۔ اُس وقت اس اخبار کے ایڈیٹر اپنے پرانے دوست استاذ محمد محمود الحافظ تھے۔ جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ اُنہوں نے مضامین کو جونئ فکر کے حامل تھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے نمایاں طور پر شائع کرنے لگے۔ لیکن عربی میں لکھنے کا باقاعدہ عمل ۱۹۹۰ء کے دہے میں شروع ہوا، جب کہ ۷ تا ۲۱ جولائی ۱۹۹۴ء میں آسمانی دنیا میں ایک نادر قسم کا بین السیاراتی دھماکہ ہوا، جو مشتری پر ایک دمدار ستارے (شومیکر) کے ٹکراؤ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس واقعے کا عالم انسانی پر بہت شدید ردعمل ہوا اور وہ حواس باختہ ہوگئے۔ اس موقع پر راقم نے قرآن حکیم اور فلکیات کی روشنی میں غور وفکر کے بعد ''اجرام سماوی اور قیامت'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو میرے ''خطبات'' میں شامل ہے۔ اور پھر اسے عربی میں منتقل کر کے ''**الأجرام السماوية تشهد على يوم القيامة**'' کے عنوان سے عالم عرب کے تمام بڑے بڑے اخبارات کو بھیجا۔ اسے کئی اخبارات ورسائل نے شائع کیا، جن میں دبی کا ماہنامہ ''الاصلاح'' اور دمشق (شام) کا ماہنامہ ''نہج الإسلام'' شامل ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس تمام عربی اخبارات ورسائل نہیں آتے اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ کن کن اخبارات ورسائل نے اسے شائع کیا۔ پھر اس کا انگریزی ترجمہ Celestial Bodies and the Doomsday کے عنوان سے ترجمہ کرا کے انگریزی اخبارات میں شائع کرایا گیا۔ چنانچہ میرے خطبات کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، جس میں یہ بحث شامل ہے۔

پھر اس کے بعد فروری ۱۹۹۷ء میں ایک ایسا نادر الوقوع سائنسی تجربہ ہوا جس نے انسانی ذہن ودماغ میں ایک تہلکہ مچادیا۔ یعنی مصنوعی طور پر کسی جانور کا ہم شکل (ڈوپلکیٹ) وجود میں لانا جسے ''کلوننگ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس کامیاب تجربے کے بعد علمی حلقوں میں یہ سوال شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ کیا اب انسان ''خالق'' بن کر مرتبہء خدائی پر فائز ہو گیا ہے؟ مگر یہ

عجیب بات تھی کہ مسلم علماء اور خاص کر عرب علماء نے اس بنیادی سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے محض اس تجربے کے ''حرام'' ہونے کا فتویٰ دینے لگ گئے۔ تو اس موقع پر بندہ نے قرآن اور حدیث کے ابدی و دوامی نصوص میں گہرائی کے ساتھ غور کرنے کے بعد ایک معرکے کی تحریر لکھتے ہوئے اس اکتشاف کو وقوع قیامت کی صداقت پر ایک ''سائنسی ثبوت'' کے طور پر پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یہ قیامت کا انکار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک حجت ہے، جو آج سائنسی طریقے سے ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس تحریر کو عربی اور انگریزی میں منتقل کر کے وسیع پیمانے پر اس کی تشہیر کی گئی، جن کے عنوانات اس طرح ہیں:

الاستنساخ الجینی یصدق علی المعاد الجسدی، Cloning Testifies Resurrection ، حیات ثانی کے عقیدے پر کلوننگ کی شہادت۔

میری یہ تحقیق عرب ممالک کے تمام بڑے بڑے اخبارات و رسائل کو بھیجی گئی۔ ہندستانی اخبارات نے بھی اسے نمایاں طور پر شائع کیا۔ اور خاص کر عربی ماہنامہ ''البعث الإسلامی'' کے ایڈیٹر حضرت مولانا سعید الرحمان صاحب ندوی اعظمی (جو اس وقت ندوۃ العلماء کے مہتمم بھی ہیں) نے اسے فوراً رسالہ مذکور میں شائع کرتے ہوئے راقم کو اس تحقیق پر مبارک باد دی کہ وقت کے اہم ترین موضوع پر قرآن اور حدیث کے حقائق سے استدلال کرتے ہوئے قرآن حکیم کی حقانیت کی ایک نئی دلیل پیش کی ہے۔ غرض اس تحقیق کو عربی اور انگریزی میں کتابچوں کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا اور انگریزی کتابچہ خاص کر غیر مسلموں میں مفت تقسیم کیا گیا اور چند ماہ میں اس کے دو ایڈیشن نکالنے پڑے۔ اور پھر عربی اور انگریزی کتابچوں کو انٹرنیٹ پر ایک ''ویب سائیٹ'' بنا کر اسے پوری دنیا کے استفادے کے لئے پیش کر دیا گیا۔ اور اس کام کو انجام دینے کے لئے میرے ایک لڑکے مولوی سعید الرحمان ندوی نے

بڑی محنت اور دماغ سوزی کی۔

پھر دوسرے سال یعنی ۱۹۹۸ء میں جب بندہ مصر کی عالمی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوا تو اس موقع پر اس عربی کتابچے کی بہت سی کاپیاں ساتھ لے جا کر کانفرنس کے شرکاء میں تقسیم کیا اور خاص کر وہاں کے صحافیوں کو یہ کتابچہ خصوصیت کے ساتھ دیا گیا۔ تاکہ وہاں کے اخبارات میں اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر ہو سکے۔ کیونکہ بعض مصریوں کے عقیدے کے مطابق قیامت محض روحانی ہوگی، جسمانی نہیں۔ اور یہ عقیدہ قرون وسطی کے بعض مسلم فلاسفہ کی دین ہے۔ اور اس بنا پر جامع ازہر کے بعض فارغین پر بھی اس عقیدے کی چھاپ صاف نظر آتی ہے، جو ایک گمراہ کن عقیدہ ہے۔

بہر حال بہت سے صحافیوں نے میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا اگرچہ عربی لکھنے کے برعکس عربی بولنے میں زیادہ مشق نہیں ہے، پھر بھی بندہ نے اپنا مافی الضمیر رک رک کر ادا کیا۔ چنانچہ میرا انٹرویو کویت کے دو ہفت روزہ اخبارات نے انتہائی شاندار طریقے سے شائع کیا جو **المجتمع** اور **مرآة الأمة** ہیں۔ چونکہ میرا کتابچہ ہر ایک کے ہاتھ میں موجود تھا اس لئے میری بحث کو سمجھنے میں اور اس کے اقتباسات شائع کرنے میں انہیں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ نیز اس کے علاوہ کویت ہی کے روزنامہ "الأنبـاء" میں بھی میرا انٹرویو شائع ہوا۔ ان تینوں اخبارات کی کاپیاں مجھے ڈاک کے ذریعہ مل گئیں۔ ان اخبارات نے ناچیز کو "المفکر الهندی" اور "العلامة" کے خطابوں سے نوازا ہے۔ مگر باقی اخبارات کی کوئی کاپی مجھے موصول نہیں ہو سکی ہے، اس لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اسے اور کن کن اخبارات نے شائع کیا ہے۔

غرض بندہ نے اپنی علمی زندگی میں اس قسم کے بہت سے مسائل پر تحقیقی کام کر کے جدید پیش آمدہ فکری و اعتقادی مسائل میں اُمت کی صحیح رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس قسم کا کام قرآن اور حدیث کے معارف میں گہرائی اور سوچ بچار کے ساتھ کرنا لازمی ہے۔ مگر اس کام

کے لئے جدید علوم ومسائل پر عبور بھی ضروری ہے۔ ورنہ "اجتہادی قوت" پیدا نہیں ہوسکتی۔ واضح رہے اجتہاد صرف فقہ وشریعت ہی میں نہیں بلکہ فکر واعتقاد میں بھی ضروری ہے۔ یعنی جدید پیش آمدہ مسائل میں قرآنی نقطۂ نظر سے غور وفکر کرکے اسلامی نقطۂ نظر واضح کرنا۔ اس قسم کے مسائل ہر دور میں پیش آتے ہیں، لہذا ہر دور میں عالم انسانی کی فکری رہنمائی ضروری ہے۔

مصر اور عمان کی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد طبیعت میں بہت زیادہ جوش اور ولولہ پیدا ہوا تو بندہ عربی میں خوب لکھنے اور اپنے افکار ونتائج کو پھیلانے کی راہ میں جُٹ گیا۔ پھر اس کے بعد عربی تصنیفات پے در پے وجود میں آتی گئیں، جو یہ ہیں۔

۱– نهضة العالم الإسلامي في ظلال القرآن الكريم

۲– خلق آدم ونظرية التطور والارتقاء

۳– بين علم آدم والعلم الحديث

۴– التجليات الربانية في عالم الطبيعة

۵– الأدلة العلمية الحديثة على المعاد الجسدي

۶– مشاهد الربوبية في دنيا النبات

۷– أهمية علم الكيمياء والفيزياء وخطورة النفط والبتروكيمائيات

۸– التقدم في العلم والتكنولوجيا، ضرورة أكيدة من منظور إسلامي

۹– أهمية الجهاد لنهضة العالم الإسلامي

۱۰– الحاجة إلى إنشاء دار الشريعة في الهند

۱۱– الاستنساخ الجيني يصدق المعاد الجسدي

۱۲– علم الكلام الحديث

۱۳ – نظرة علی تعدد الزوجات

اکیڈمی کے بعض محسنین ومعاونین

اس موقع پر ادارے کے بعض محسنین اور کرم فرماؤں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کی امداد واعانت اور تعاون کی بدولت یہ ادارہ بعض مشکل ترین حالات میں بھی اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ چنانچہ اس سلسلے میں بمبئی اور مدراس کے علم دوست احباب کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور اس راہ میں اپنے بڑے لڑکے مولوی شفیق الرحمان نے بھی قابل لحاظ کردار ادا کیا ہے، جو بمبئی میں کئی سال قیام کر کے علم دوست حضرات کو اکیڈمی کا سالانہ ممبر بنایا کرتے تھے۔ اس طرح ۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک اکیڈمی کو خوب مالی تعاون ملا اور اس عرصے میں کتابیں بکثرت شائع ہوئیں، جو ممبروں کو سالانہ ممبر شپ کے عوض مفت بھیجی جاتی تھیں۔ اور یہ کام مدراس میں بھی ہونے لگا۔ یہ اکیڈمی کی ترقی وتشہیر کا ایک سنہرا دور تھا۔ اس سلسلے میں بنگلور کے بھی کچھ علم دوست حضرات کا تعاون بھی ضرور تھا مگر وہ برائے نام تھا۔ ہاں البتہ بنگلور کی ایک واحد شخصیت وہ تھی جنہوں نے اس راہ میں فیاضانہ طور پر سخاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے بنگلور کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا تھا۔ میری مراد محسن قوم جناب دانیال قاضی صاحب سے ہے۔ نیز ان کے علاوہ مولانا بدرالدین قاسمی، قاری عبدالحمید ندوی، بابو بھائی مرچنٹ، ڈاکٹر کے حسین، جناب عبدالرحمان قمرالدین صاحب اور جناب مصلح الدین صاحب وغیرہ وغیرہ بہت سے علم نواز احباب جن کی علم پروری اور رہنمائی کے بار سے یہ ادارہ بوجھل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ.﴾

قرآن کی گمشدہ چابی

حاصل یہ کہ جب تک قرآن اور حدیث کی گہرائیوں میں اُتر کر غور وخوض نہ کیا جائے جدید مسائل ومشکلات کا حل کسی بھی طرح نکل نہیں سکتا۔ جدید مسائل خواہ وہ شرعی وفقہی ہوں یا فکری وکلامی (جن کا تعلق عقیدہ واعتقاد سے ہو) ان تمام کا حل نکالنے کے لئے سب سے پہلے قرآن اور حدیث کے معانی ومطالب اور اُن کے رُموز وحقائق پر عبور حاصل کرنا اور ان کو اچھی طرح ''ہضم'' کر لینا ضروری ہے۔ پھر جب کوئی نیا مسئلہ پیش آجائے تو جو مسئلہ جن علوم سے متعلق ہو اُن کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن اور حدیث کی ''نظر'' سے اُس مسئلے کو دیکھا جائے تو اُس وقت متعلقہ مسئلے کا حل نکل آئے گا اور اُس میں جو ''حق'' ہے وہ ظاہر ہو جائے گا اور جو ''باطل'' ہے وہ چھٹ جائے گا۔ اس اعتبار سے قرآن کو ''فُرقان'' کہا گیا ہے، جو حق وباطل میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہے۔ مگر اس کے لئے قرآن اور حدیث اور جدید علوم دونوں کا ''تقابل'' ضروری ہے، ورنہ کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ بندہ نے عصر جدید کے بہت سے مشکل مسائل کا حل اسی طرح نکالا ہے۔ اور یہ میرے لئے فخر کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ خداوند کریم کا مجھ پر ایک خصوصی کرم واحسان ہے کہ میں اس قابل ہو سکا۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم ایسے حیرت انگیز حقائق سے بھرا ہوا ہے جو دنیائے انسانیت کو اُٹھا اور بٹھا سکتے ہیں۔ وہ کوئی مُعمہ یا پیچیدہ کلام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک واضح چیز (قرآن مبین) ہے۔ اور اس کے معانی ومطالب میں بھی کوئی ہیر پھیر یا فلسفیانہ قسم کی مشکل پسندی نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود حاملین قرآن خود اپنی ہی کتاب کو سمجھنے سے عاجز ہیں تو اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب الٰہی ہر دور کے تعلق سے ایک ''بند باب'' کی حیثیت رکھتی ہے جسے کھولنے کی چابی عصری علوم ہوتے ہیں۔ اور یہ ہمیشہ اور ہر دور کے لئے ایک ''سنت الٰہی''

ہے، جس کے اُصول قرآن میں مفصل طور پر مذکور ہیں۔ اس اعتبار سے عصر جدید میں قرآن کے مقفّل باب کو کھولنے کی چابی ''علم فطرت'' ہے، جسے ہم علم مظاہر یا علم الاشیاء یا علم الاسماء یا جدید تعبیر کے مطابق ''سائنس'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن آج کل اہل علم جدید سائنس کے نام ہی سے بھڑک اُٹھتے ہیں، کیونکہ یہ علم اُن کے لئے نامانوس ہے۔ مگر نام میں کیا رکھا ہے، یہ حقیقتاً وہی علم ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کو بطور ''اسماء'' یعنی چیزوں کے نام کے طور پر عنایت کیا گیا تھا۔ اور یہ وہی علم ہے جسے ہمارے قدیم علماء نے ''تکوینیات'' یا علم تکوین قرار دیا ہے، یعنی ''خلق وایجاد'' کا علم جو اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ اس لحاظ سے علم تکوین (سائنس) دراصل مظاہر کائنات کے مطالعے کا نام ہے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اور پھر قرآنی علم اور کائناتی علم کی تطبیق سے نہ صرف الحادو مادیت کا رد ہوتا ہے بلکہ جدید مسائل کا حل بھی مل جاتا ہے۔ کیونکہ اس کائنات کے نظاموں میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو قرآنی صداقتوں سے متصادم ہو سکے۔

غرض علم تکوین یا علم الاشیاء (سائنس) نہ صرف جدید مسائل کو (قرآنی نقطۂ نظر سے) حل کرنے کی چابی ہے (جس کے نتیجے میں الحادو مادیت کا رد ہوتا ہے) بلکہ وہ خلافت ارض کی بھی چابی ہے، جسے یہ بندۂ حقیر نے اپنے پچاس سالہ تحقیقی مطالعے کے بعد کھوج نکالا ہے۔ اور یہ چابی اب میں ایک خدائی امانت کے طور پر پوری اُمت کے حوالے کر کے اپنی راہ لے رہا ہوں۔ لیکن اگر اُمت نے اسے کسی مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا یا اس چابی کو پھینک دیا تو پھر اُسے اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔

اللهم هل بلغت؟ فاشهد.

یقین محکم عمل پیہم

اس فقیر حقیر کی پوری زندگی انواع واقسام کے مجاہدوں، مشقتوں اور آلام ومصائب سے بھری ہوئی ہے، جو اس راہ میں کام کرنے والوں کے لئے ایک سبق بن سکتی ہے۔ میں اپنی تعریف وتوصیف خود کرنا ہرگز پسند نہیں کرتا، بلکہ اپنی داستان حقیقت سنارہا ہوں۔ بندہ نے اس راہ میں دیوانہ وار کام کرتے ہوئے ایک ایسا عالی شان تحقیقی مرکز کھڑا کر دیا ہے، جس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ بقول شخصے یہ اکیڈمی نہیں بلکہ ''ایک آدمی'' ہے۔ اور بندہ بغیر کسی فخر وتکبر کے نہایت صاف دلی کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ یہ پورے عالم اسلام میں اپنی نوعیت کا اولین ادارہ ہے، جو خالص قرآنی فکر کی تحقیق وتدقیق اور اُس کے خالص افکار کی ترویج واشاعت کے لئے وجود میں آیا ہے۔ اور اگر خدانے چاہا تو اس کے ثمرات وحاصلات بہت جلد ظاہر ہونے لگ جائیں گے۔ بندہ نے یہ کام کسی دنیوی مقصد یا کسی قسم کے لالچ میں نہیں بلکہ خالص رضائے الٰہی کے جذبے کے تحت کیا ہے۔ ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ.﴾ اسی لئے میں نے ادارے سے کچھ لینے کے بجائے اسے اپنا سب کچھ سونپ دیا ہے۔ اور پھر نہ صرف اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کر کے پوری زندگی قربان کردی ہے بلکہ اپنے لڑکوں کو بھی اسی ''آگ'' میں جھونک دیا ہے، جو اس وقت ادارے کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ اللہ کے بعد اب میرا ان کے علاوہ اور کوئی یار ومددگار اور پُرسان حال تک نہیں ہے۔ قرآن ہی کے لئے جینا اور قرآن ہی کے لئے مرنا یہی میرا واحد مقصد ہے۔ اور اس مقصد کے لئے میں نے اپنے بچوں میں بھی قرآن کی روح بھرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ انہیں اس راہ میں ثابت قدم رکھے اور اس ادارہ کو غیبی امداد سے مالا مال کر کے اسے بارآور اور ثمرآور بنادے، تاکہ اس کا فیض ہمیشہ جاری رہے اور وہ سارے عالم کے لئے ایک پمپ ہاؤس کا سا کام کرتا رہے۔ آمین۔ اس راہ میں کام

کرنے والوں کے لئے علامہ اقبال کا یہ شعر بطور ایک آئیڈیل ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ ع

یقیں مُحکم عمل پیہم محبت فاتح عالم جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

اکیڈمی کا مستقبل کیا ہوگا؟

ٹیپو سلطان شہیدؒ کی سرزمین سے برپا ہونے والی یہ اولین قرآنی تحریک ہے اور پورے جنوبی ہند کی تاریخ میں اس قسم کا کوئی بھی تحقیقی مرکز اب تک قائم نہیں ہوا ہے۔ میں نے جہد مسلسل کے ذریعہ اپنا فرض پورا کر دیا ہے اور اس اُمت کی فلاح کے لئے پوری امانت داری کے ساتھ کام کیا ہے۔ مگر اب مجھے اس کے مستقبل کی فکر کھائے جارہی ہے کہ میرے بعد اس گلشن علمی کا حشر کیا ہوگا؟ اس وقت اکیڈمی کے جو اثاثہ جات ہیں وہ تقریباً ۷۵ لاکھ روپیئے مالیت کے برابر ہیں۔ اور ان اثاثہ جات میں دو عمارتیں بھی شامل ہیں۔ یعنی اس وقت بندہ جس عمارت میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے وہ بھی اکیڈمی کی ملکیت ہے۔ اور ان سب کے کاغذات اور حساب کتاب باقاعدگی کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ۱۹۸۶ء سے لے کر اب تک کی آڈٹ رپورٹیں بھی موجود ہیں۔ اور اس ادارے کے انتظام وانصرام اور اس کی دیکھ بھال کے لئے میرے حسب ذیل تین لڑکے متعین ہیں:

۱- مولوی سعید الرحمان ندوی (ایم اے)

۲- مولوی حافظ جمیل الرحمان ندوی

۳- مولوی انیس الرحمان ندوی، بی اے

پہلے لڑکے میری کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کر رہے ہیں۔ دوسرے اکیڈمی کے انتظامی اُمور کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور تیسرے تصنیف وتالیف کی ٹریننگ لے رہے ہیں۔ یہ

تینوں کمپیوٹر سائنس کے بھی ماہر ہیں اور میری کتابوں کی کمپوزنگ ارود، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں بخوبی کر لیتے ہیں۔ اور یہ تینوں بہت ہونہار اور مُطیع و فرمانبردار ہیں۔ تقریباً دس بارہ سال سے میرے ساتھ کام کر رہے ہیں اور میری فکر سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ اور میری کتابوں کی نشر اشاعت کا بار بوجھ انہی کے کندھوں پر ہے۔

لیکن وہ میری طرح اوریجنل طور پر لکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے لئے جتنے علوم سے واقفیت درکار ہے وہ انہیں حاصل نہیں ہے۔ بلکہ میرے بچے ہی کیا ایسا شخص مشکل ہی سے ملے گا جو قرآنی علوم اور سائنسی علوم دونوں پر یکساں طور پر عبور رکھتا ہو۔ اور اگر رکھتا بھی ہو تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ ان دونوں کو کلامی (یا فلسفیانہ) طور پر سمجھا بھی ہو۔ لہذا بندہ بطور تحدیث نعمت عرض کرتا ہے کہ میں نے یہ کام اسی نقطۂ نظر سے اجتہادی طور پر کیا ہے، جیسا کہ تفصیل شروع میں بیان کر چکا ہوں۔ لہذا اب اس دشوار گھاٹی کو عبور کرنے کے لئے ایک ٹیم ورک ضروری ہے، جس میں قرآنی علوم اور سائنسی علوم اور فلسفیانہ یا کلامی علوم سب کے ماہرین جمع ہو کر کام کریں۔ لیکن پھر وہی ''بھانت بھانت کی بولیوں'' والا مشکل مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے صحیح اسلامی فکر رکھنے والے مسلم ماہرین کو تلاش کرنا اور انہیں اونچی اونچی تنخواہیں اور وظیفے دینے ہوں گے۔ تاکہ وہ پوری دلجمعی اور رغبت کے ساتھ کام کریں۔ لہذا جب تک تمام مسلمان مل کر یہ کام نہ کریں اُمت کی نشأۃ ثانیہ ایک خواب ہی خواب رہے گی اور سب کے سب گنہگار ہو جائیں گے۔

مگر ملت کی نشأۃ ثانیہ کا یہ کام ''فقہی اختلافات'' کا مزاج رکھنے والے افراد کبھی نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ کام اُن کے لئے بالکل ''اجنبی'' ہے۔ لہذا اس کام کو صحیح ڈھنگ سے کرنے کے لئے قرآن اور حدیث کا صحیح ''فہم'' ضروری ہے، جسے ''تفقہ فی الدین'' کہا جا سکے۔ اور پھر یہ فہم

قرآنی علوم اور عصری علوم کے ''تقابل'' سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا جب تک اسلامی مدارس اس قسم کے افراد پیدا نہ کریں یہ کام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اور اس وقت میری نظروں میں دُور دُور تک ایسا کوئی فرد نظر نہیں آ رہا ہے جو حقیقی معنیٰ میں میرا جانشین بن سکے۔ اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے صلاحیت کے ساتھ ساتھ اس کام سے لگن اور اخلاص کا جذبہ ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ کام محض پیسہ دے کر کرایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ پیسے کی خاطر کام کرنے والوں میں مقصدیت مفقود ہوتی ہے۔ لہذا اب یہ پوری اُمت کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ ایسے مخلص اور باصلاحیت افراد کو ڈھونڈھ نکالیں۔ اور یہ سوال آج ہر قسم کے جماعتی، مسلکی، گروہی اور علاقائی عصبیتوں سے اُوپر اُٹھ کر دیکھنے کا ہے کہ یہ اُمت مجموعی اعتبار سے کیا ہے اور دین وایمان کے تحفظ کے ساتھ ساتھ خلافت ارض کی بازیابی کے لئے کیا اقدامات کر رہی ہے؟ اگر یہ چنگاری کسی کے سینے میں موجود نہ ہو تو وہ مسلمان نہیں بلکہ راکھ کا ایک ڈھیر ہے۔ لہذا اب تمام اہل قبلہ کو ہر قسم کے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ملت اسلامیہ کی مجموعی اعتبار سے فلاح و بہبود اور اُس کی تعمیر نو کے لئے باہم متحد ہونا ضروری ہے۔ آج ہمارے سروں پر جو طرح طرح کے خطرات منڈلا رہے ہیں اور کفر وشرک کے جو طوفانی جھکڑ ہم کو تہہ و بالا کر کے صفحۂ ہستی سے میٹ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اگر ان کے سد باب کے لئے ہم سب اُٹھ نہ کھڑے ہوئے تو پھر کوئی بھی حنفی واہل حدیث اور دیوبندی و بریلوی باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اُتر جائیں گے۔ چنانچہ اب ان سب کو متحد کرنے کا ایک ہی راستہ بچا ہے کہ سب مل کر ''قرآنی فکر'' کو آگے بڑھائیں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ یا خلافت ارض کی بازیافت کے لئے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں۔

بہر حال فرقانیہ اکیڈمی پوری قوم وملت کی خدمت کے لئے وقف ہے، وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ لیکن اپنے پچھلے تجربات کی رُو سے اس کی ترقی میں دو قسم کی بنیادی رکاوٹیں

حائل رہی ہیں: (۱) اچھے رفقاء کی کمی (۲) مالی وسائل کی قلّت ۔ چنانچہ مالی وسائل جٹانے کے لئے جب بھی کسی بڑے آدمی کے دروازے پر دستک دی تو اکثر و بیشتر مجھے جواب ملا کہ یہ تو ایک ''شخصی ادارہ'' ہے۔ لیکن جب ان طعنوں سے بچنے کے لئے میں نے اسے ایک ٹرسٹ بنا دیا تو پھر بعض حاسدوں نے لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ تو ایک ''خاندانی ٹرسٹ'' ہے۔ حالانکہ ٹرسٹ ڈیڈ میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ یہ خاندانی ٹرسٹ ہے، بلکہ صاف وصریح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ ادارہ پوری ملت کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے گا۔ مگر حاسدین کا مُنہ کون بند کر سکتا ہے۔ میں اپنا سینہ چیر کر لوگوں کو یہ دکھانے سے رہا کہ میرے دل میں کیا ہے؟ دل کی حالت کون جانے؟ اور پھر اس پر طرفہ تماشہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں نے اسے ایک ''بیمار'' ادارہ سمجھ کر اس پر قابض ہو جانے کی بھی کوشش کر ڈالی۔

بہر حال ان سب تلخ حقائق سے دوچار ہونے کے بعد اب پھر وہی سوال آ کھڑا ہوا ہے کہ میرے بعد کوئی کرم فرما اسے پھر ایک ''بیمار'' ادارہ سمجھ کر اس پر دست دارزی کر نہ بیٹھے۔ اور جس دن ایسا ہوا اُس دن فرقانیہ اکیڈمی کی تحریک بالکل مردہ ہو جائے گی اور وہ محض ایک میوزیم بن کر رہ جائے گی۔ اور لوگ اُسے ایک عجیب و غریب چیز سمجھ کر دیکھنے کے لئے دُور دور سے آ جایا کریں گے۔ اور ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ میری شان میں کوئی قصیدہ پڑھ کر آگے بڑھ جائیں کہ واہ بھائی کیا خوب آدمی تھا۔

لہذا ہمدردان ملت سے میری درد بھری گزارش ہے کہ وہ اس ادارہ کے اغراض ومقاصد اور اُس کی کارکردگی کو بصیرت کی نظروں سے دیکھیں اور پھر اگر انہیں اس میں کوئی خیر محسوس ہو تو اس کی شایان شان حمایت وسرپرستی کریں۔ مگر للہ اس کے ''اندر'' گھس کر اس پر قبضہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ یہ ادارہ قوم وملت کے لئے تھا، ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ مگر اسے کسی بھی طرح

"مُردہ گھر" بننے نہیں دیا جائے گا۔ ایک تحقیقی ادارہ چلانے کے لئے پہلے قابل افراد پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور جب تک افراد نہ ہوں کسی ادارے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ تو کیا اُمت اس چیلنج کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے؟ یہ وقت کا سب سے بڑا سوال ہے۔

کون ہوتا ہے حریف سے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

☆☆☆☆☆

تیسرا باب:

بعض خاندانی احوال وکوائف

مجھے کسی کے ذاتی احوال وکوائف سے واقفیت حاصل کرنے میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، سوائے سیرت رسالت مآب صلعم، صحابہ کرام اور بعض ائمہ دین کے۔ ہاں البتہ بوقت ضرورت کسی کے بارے میں تھوڑی بہت تحقیق ضرور کرلی۔ لہذا مجھے اپنے حالات زندگی بیان کرنے کا بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ میری علمی داستان پڑھنے کے بعد بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال ضرور پیدا ہوسکتا ہے کہ میں کون ہوں اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہوں؟ تو بطور خانہ پری اپنے بعض حالات مختصر طور پر عرض کردینا چاہتا ہوں۔ اور چونکہ میری اس خاندانی داستان میں بھی بعض عبرت وبصیرت کی چیزیں موجود ہیں، لہذا اس کا تذکرہ ضروری بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا ددھیال

میرا خاندانی تعلق شیوخ گھرانے سے ہے، لیکن ان کا اصل سلسلہ نامعلوم ہے مگر میرے ایک جداعلیٰ محمد حیات جمعدار شیر میسور ٹیپو سلطان شہیدؒ کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ اور میرا سلسلہ

میری علمی زندگی کی داستانِ عبرت

نسب اس طرح ہے: راقم الحروف بن الحاج عبدالرشید، بن محمد اکبر، بن محمد، بن محمد حیات جمعدار۔

محمد حیات کے والد بھی ٹیپو سلطان کی فوج میں ایک اعلیٰ افسر تھے، جن کا ایک ہاتھ کسی جنگ میں کٹ گیا تھا۔ مگر ان کا نام معلوم نہیں ہے۔ مگر وہ ایک ہاتھ کٹ جانے کے باوجود ہمیشہ جنگوں میں دوسرے ہاتھ سے لڑتے تھے۔ محمد حیات کا نکاح حیدرآباد کی کسی وزیرزادی سے ہوا تھا، جن کا نام غیر معلوم ہے۔ ان کو جہیز میں بعض قیمتی تحفوں کے علاوہ ایک نادر تحفہ ملا تھا جو سونے کے حروف میں لکھا ہوا قرآن مجید تھا اور وہ ہمارے دادا محمد اکبر صاحب تک وراثت میں آیا تھا، جو بعد میں چوری ہو گیا۔ ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد محمد حیات صاحب بنگلور سے تقریبا چالیس میل دور ایک مقام ''ادرنگی'' کے قریب کسی جگہ آ کر بس گئے تھے اور ایک زمیندار کی حیثیت سے اپنی باقی زندگی بسر کی۔

محمد صاحب کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر طاقتور تھے، جن کا رعب و دبدبہ پورے علاقے پر تھا اور اُنھوں نے ایک بار ایک شیرنی کو ڈرا کر بھگا دیا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک ریچھ پر کلہاڑے سے حملہ کر کے اُسے بھگا دیا تھا۔

ہمارے دادا اکبر صاحب بھی ادرنگی کے ایک زمیندار اور تاجر تھے اور وہ اس علاقے کے رئیس اعظم کہلاتے تھے۔ ان کی سخاوت اور دریا دلی کے قصے آج بھی وہاں کے عوام میں مشہور ہیں اور لوگ ان کا نام بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں ان کو اُس وقت دیکھا تھا جب میری عمر پانچ چھ سال رہی ہوگی۔ ان کی گردن پر شکر کا پھوڑا ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کی وفات کے بعد بعض لوگوں نے ہماری پوری آبائی جائیداد دھوکے اور جعلسازی کے ذریعہ ہتھیالی۔ اور ہمارا آبائی گھر آج بھی وہاں پر ایک ملبے کے ڈھیر کی شکل میں موجود ہے۔ کیونکہ ہمارے خاندان کا کوئی بھی فرد آج وہاں پر موجود نہیں ہے۔ میرے دو

چچازاد بھائی کبیر احمد اور منیر احمد تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مقیم ہیں۔ اول الذکر سول انجینئر ہیں، جو کے ڈی اے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔

میرا ننہال

میرے دادا اور نانی آپس میں سگے بھائی بہن تھے۔ ہماری نانی کلثوم بی کا سسرال بنگلور کے مضافات میں بمقام ''چک باناور'' ہے۔ ہمارے نانا کا نام امام خاں، بن عثمان خاں، بن حسن خاں ہے۔ عثمان خاں کی شادی ''چنتامنی'' سے قریب ایک مقام ''چولور'' کے قاضی صاحب کی دختر سے ہوئی تھی، جن کا تعلق سادات خاندان سے تھا۔ عثمان خان بھی چک باناور کے قاضی تھے۔ ہمارے نانا امام خاں ایک صاحب علم شخص تھے جو اس علاقے کے سرقاضی مقرر ہوئے تھے۔

ہماری نانی کلثوم بی ایک بہت بڑی عالمہ وفاضلہ تھیں جو قرآن، حدیث، فقہ، سیرت وغیرہ تقریباً تمام دینی علوم میں دسترس رکھتی تھیں۔ اگر چہ مطالعہ اردو کتابوں تک محدود تھا، لیکن تمام مسائل پر عبور حاصل تھا۔ حافظہ بہت تیز تھا۔ اور موصوفہ کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا۔ گھر میں ہر وقت وعظ وارشاد اور دینی مسائل کا چرچا رہتا۔ اس کے علاوہ گھر ہی میں تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اور اُنہوں نے چک باناور کے تمام بچوں، بڑوں اور عورتوں کو نہ صرف ناظرہ قرآن پڑھایا بلکہ انہیں دینی مسائل بھی بتایا کرتی تھیں۔ اس بنا پر اطراف واکناف میں خوب شہرت ہوئی اور لوگ دور دور سے مسئلے مسائل پوچھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمارا ننہال مرجع خلائق بن گیا تھا۔ نانا سرقاضی تھے اور گھر ایک مدرسہ تھا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ ہماری نانی نے کبھی کسی سے بطور معاوضہ ایک پیسہ تک قبول نہیں کیا، بلکہ پوری تعلیم وتدریس بالکل مفت ہوتی تھی۔ یعنی إن أجری إلا علی الله.

ہماری والدہ بیان کرتی ہیں کہ نانی پر ہمیشہ عشق الٰہی کا غلبہ طاری رہتا تھا۔ چنانچہ لگ

بھگ ۱۹۲۰ء میں وہ حج کے لئے روانہ ہوگئیں اور پھر دیار حبیب پہنچ کران کا عشق الٰہی رنگ لایا اور وہ وہیں کی ہوکر رہ گئیں اور حرم نبوی میں جاروب کشی کرتے اپنی باقی زندگی بتانے کو سب سے بڑا فخر واعزاز تصور کرلیا۔ اور اپنی بیٹی داماد کو کبھی یاد تک نہیں کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد بنگلور کے کچھ حاجیوں کی ملاقات نانی ماں سے مسجد نبوی میں ہوئی تو اُنہوں نے پوچھا کہ آپ کی بیٹی کے لئے کوئی پیغام ہے؟ تو اُنہوں نے کہلا بھیجا کہ ''کہدینا کہ ایک دل میں دو کی محبتیں سما نہیں سکتیں''۔ یعنی اب میرے دل میں سوائے اللہ کے اور کسی کی محبت نہیں ہے۔ اللہ اللہ! اس جذب و سرمستی کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ اللھم اغفر لھا وارحمھا.

میرے والدین

میرے والد عبدالرشید اگرچہ ایک رئیس زادے تھے، مگر اُنہوں نے بعض اسباب کی بنا پر ہمارے آبائی وطن ''ادرنگی'' سے ہجرت کر کے اپنے سسرال کو اپنا مسکن بنالیا جس کی وجہ سے ہماری آبائی جائیداد ہاتھ سے نکل گئی۔ چک بانا ور آ کر اُنہوں نے تجارت شروع کی اور اس میں اُنہوں نے میرے بڑے بھائیوں کو بھی لگایا۔ اور یہ کاروبار مشترکہ طور پر تھا، جس کی وجہ سے والد صاحب ہمیشہ بددل اور نالاں رہتے تھے۔ ان کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے۔ موصوف نہایت درجہ کریم النفس اور سادہ مزاج تھے اور ہماری زندگی تکلفات سے پاک تھی۔ موصوف اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر وہ مقامی مسجد میں اعزازی طور پر امامت کے علاوہ قضاء کے فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے۔ اُس دور میں قضاء کا مطلب تھا شرعی پنچایت، جس کا سربراہ مسجد کا متولی ہوا کرتا تھا۔ اور لوگ پڑھانے والے کو بھی قاضی ہی کہا کرتے تھے۔ موصوف کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔ اور یہ وہی سال ہے جب راقم کو قرآن کے شعوری مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔

ہماری والدۂ ماجدہ ہاجرہ خاتونؒ ہماری نانی ہی کی طرح ایک زبردست بلکہ نادرالوجود عالمہ وفاضلہ تھیں، جن کو ہماری نانی نے پڑھایا اور اُن کی خصوصی تربیت کی تھی۔ چنانچہ موصوفہ کا حافظہ اس قدر قوی اور خداداد تھا کہ جو کتاب ایک دو بار پڑھی وہ نقش کالحجر بن گئی۔ چنانچہ قرآن، حدیث، فقہ، اسلامی تاریخ اور سیرت وسوانح کے تقریبا تمام مسائل پر آپ کو عبور حاصل تھا اور جب بھی کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ برجستہ طور پر ان علوم اور خاص کر قرآن اور حدیث کے معانی ومطالب سے استدلال کرتی تھیں۔ اور اس سلسلے میں قرآن کی آیتیں عربی میں سنا کر اُن کا ترجمہ اردو میں کرتی تھیں۔ اگرچہ موصوفہ عربی زبان نہیں جانتی تھیں بلکہ قرآن اور حدیث کا اُنہوں نے صرف ترجمہ پڑھا تھا مگر مطالعہ وحافظہ غضب کا تھا۔ اور پھر اُنہوں نے قرآن اور حدیث کا صرف مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے معانی ومطالب میں غور کر کے ان پر اتنا عبور حاصل کر لیا تھا کہ وہ تقریبا ہر مسئلے میں قرآن اور حدیث کی سند پیش کرتی تھیں۔ اس بنا پر نانی مرحومہ کی طرح والدۂ محترمہ کی شہرت بھی دور دور تک پہنچی ہوئی تھی اور لوگ آپ کی باتیں سننے کے لئے اکثر آجایا کرتے تھے اور وہ گھنٹوں دین وشریعت کی باتیں بیان کرتی تھیں۔ ہمارے گھر میں دینی کتابوں کا ایک خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا، جن میں بہت سی کتابیں ہماری نانی مرحومہ کی تھیں۔ والدۂ محترمہ کی وفات ۱۹۸۱ء میں ہوئی، جب کہ وہ تقریبا ۸۸ سال کی تھیں۔

اوپر میں نے اپنے خاندان کے جو حالات وواقعات بیان کئے ہیں وہ سب والدۂ محترمہ کی زبانی سنے ہوئے ہیں۔ اور اس بنیاد پر میرے لڑکوں نے اپنا ایک خاندانی شجرہ تیار کر لیا ہے۔

علمی بحث ومباحثہ

ہم پانچ بھائی تھے اور ہماری تین بہنیں تھیں۔ ہماری والدہ نے ہم سب کی خصوصی تربیت کی تھی اور ہمارا گھر دینی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ چنانچہ والدہ گھر میں کسی بھی قسم کی بے اعتدالی

اور لا اُبالی پن کو کسی بھی طرح برداشت نہیں کرتی تھیں، بلکہ ہمیشہ ڈانٹا کرتی تھیں۔ ہم سب بھائیوں کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا اور ہم اکثر و بیشتر عشاء کی نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر دینی مسائل میں بحث و مباحثہ کرنے بیٹھ جاتے تھے۔ پانچ بھائیوں میں سب سے چھوٹا میں ہی ہوں اور ان چاروں کے نام اس طرح ہیں:

۱- محمد صادق (م۱۹۸۲ء)

۲- محمد صدرالدین (م۱۹۷۷ء)

۳- مولانا حکیم محمد سراج الدین عمری (م۱۹۷۵ء)

۴- مولوی محمد محی الدین (م۱۹۹۴)

اور میری تین بہنیں یہ ہیں:

۱- صغریٰ بانو (م۱۹۸۷)

۲- حامدہ بانو (م۱۹۸۹)

۳- محمودہ بانو

پہلے دو بھائیوں کی اسکولی تعلیم ہمارے خاندانی روایات کے مطابق زیادہ نہیں تھی۔ تیسرے بھائی اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر جامعہ دارالسلام عمرآباد میں تعلیم حاصل کی اور پھر اُنہوں نے نظامیہ طبی کالج حیدرآباد سے بھی طب کی سند حاصل کی تھی۔ اور اُنہوں نے ہی چوتھے بھائی کو عمرآباد کے مدرسے میں تعلیم دلوانے کی کوشش کی تھی، مگر وہ اپنی تعلیم پوری نہیں کر سکے۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد بعض تلخ واقعات پیش آئے اور زندگی میں پہلی بار اس حقیقت کا احساس ہوا کہ والد کا سایۂ شفقت کیا ہوتا ہے۔ مگر یہ تلخیاں زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہیں، کیونکہ اسی دوران میری زندگی میں ایک انقلابی موڑ آ گیا جس نے مجھے دنیا و مافیہا سے

بالکل غافل کر کے ایک نئے مشن کی طرف موڑ دیا۔ یعنی میرے ہاتھ وہ کتاب لگ گئی جس نے مجھے عربی زبان کی تعلیم اور سائنسی علوم کی تحصیل کی طرف آمادہ کر کے مجھے ایک نئی جہت اور نئی سمت سے روشناس کرادیا، جس کے نتیجے میں بندہ اپنا علمی و قلمی سفر پورا کر کے آج یہ کتاب لکھ رہا ہے، جو سارے عالم اسلام کے لئے ایک علمی تحفہ ہے۔

والدۂ مرحومہ کا ایک نادر تحفہ

مگر بندہ نے پورے پچاس سال کے بعد جب پیچھے مڑ کر دیکھا اور کتاب الٰہی سے میری اس دیوانہ وار جذب و عشق کی اصل وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ صرف ''دو قرآن'' کا کرشمہ نہیں بلکہ اس کی ایک اور بنیادی وجہ تھی جو آج میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ اور وہ میری والدۂ مرحومہ کا وہ عظیم تحفہ ہے جس نے مجھے صحیح معنی میں اس راہ پر ڈال دیا تھا۔ چنانچہ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ والدہ محترمہ نے اس بندۂ حقیر کو صرف تین سال کی عمر میں خصوصی طور پر سورۂ مزمل حفظ کرادیا تھا۔ چنانچہ وہ بیان کرتی تھیں کہ جب میں اتنی چھوٹی سی عمر میں سورۂ مزمل کو پڑھ کر سناتا تو لوگ تعجب سے انگشت بدنداں رہ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ آج میں اس واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ والدۂ مرحومہ نے نہ صرف قرآن کو میری گھٹی میں ڈال دیا تھا بلکہ مجھے شعور آنے سے پہلے ہی کلام الٰہی کو میرے لاشعور میں بھر دیا تھا۔ یہ گویا کہ قرآن کی پہلی اذان تھی جو میرے کان میں پڑی۔ اور جب ۱۹۵۲ء میں دوسری اذان میرے کانوں میں پڑی تو میں تڑپ اُٹھا کہ اب مجھے حقیقت کا پتہ لگانا ہی چاہئے۔ پھر اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں تفصیل سے پچھلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ میرے والدین کی بال بال مغفرت کرے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے آمین۔

اب میں سوچتا ہوں تو مجھے یہ بھی نظر آتا ہے کہ میرے اس عشق قرآنی میں میری نانی مرحومہ کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے جو صحیح معنی میں فنافی اللہ کا نمونہ تھیں۔ اس طرح بندہ کو وراثت میں کئی چیزیں ملی ہیں۔ اور یہ سب باریٔ تعالیٰ کی عنایات ونوازشات ہیں کہ اُس نے ہمارے خاندان کو کئی خصوصیات سے نوازا اور اپنے دین متین کی خدمت کے لئے آمادۂ عمل کیا۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

سرزمین ٹیپو کا ایک دوسرا تحفہ

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہمارے اجداد میں سے دو بزرگ شیر میسور ٹیپو سلطان شہید کی فوج میں فوجی افسروں کی حیثیت سے موجود تھے۔ اور ان میں سے ایک کا ہاتھ جنگ میں کٹ گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان شہید کے جان نثاروں میں سے تھے۔ غرض ان دونوں نے جہاد عسکری میں شامل ہو کر اپنا فرض بخوبی نبھایا تھا۔ اس طرح ہمارے خاندان کے دو اجداد نے غازی ہونے کا شرف حاصل کیا۔ اور اب ان کے اخلاف میں سے ایک فرزند (راقم الحروف) نے علمی وقلمی میدان میں اُسی مجاہدانہ روح اور جہادی اسپرٹ کے ساتھ کام کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مجاہدانہ اسپرٹ کا یہ جذبہ مجھے اپنے اخلاف ہی سے ملا ہوگا جو خداوند کریم کی عنایت خصوصی ہے۔ ورنہ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ اس اعتبار سے ہمارے خاندان کو جہاد عسکری اور جہاد علمی دونوں جہادوں سے مشرف ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ فالحمدللہ علی ذلک۔

الغرض شہید ملت وشہید وطن مجاہد اعظم ومحی الملت ٹیپو سلطان شہید نے باطل قوتوں کے آگے سرنگوں ہونے کے بجائے ناموس وطن اور حُرمت دین کی راہ میں اپنا سر کٹا کر وفائے دین ووطن کی ایک نادر مثال قائم کر دی اور باطل کی سرکوبی کے لئے ایک چٹان کی طرح ڈٹ کر اپنا آخری خطرہ خون بہا دیا جو شجاعت وعزیمت کی ایک ناقابل فراموش مثال ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں شیر میسور کا مقولہ تھا کہ ''گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی یک روزہ زندگی بہتر ہے۔'' یہ ایک

ایسا ولولہ انگیز پیغام ہے جو سارے جہاں کے مجاہدوں میں جہاد کی حقیقی روح پیدا کر سکتا ہے، کہ باطل قوتوں کے آگے سرخم کرنے اور بزدلی بلکہ گیدڑ کی زندگی گزارنے کے بجائے جام شہادت نوش کرنے کا راستہ اختیار کریں اور ناموس دین وحُرمت وطن پر خود کو مٹا کر دین وملت کا احیاء کریں۔ ورنہ اسلام کی صبح نو کبھی طلوع نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ اب اس فقیر حقیر نے جو اسی مجاہد اعظم اور شہید ملّت کے جان نثاروں کا ایک ادنیٰ سا خلف ہے، خالص قرآنی فکر کے احیاء اور اُس کی ترویج واشاعت کے لئے فرقانیہ اکیڈمی قائم کر کے ملت کو ایک اور نئی راہ دکھائی ہے۔ اس طرح یہ علمی چمن زار انشاء اللہ سارے عالم کے لئے ایک لائیٹ ہاؤس کی طرح ہمیشہ ضیاء پاشیاں کرتا رہے گا۔ اور یہ سرزمین ٹیپو شہید کا ایک دوسرا اور ناقابل فراموش تحفہ ہے۔ اور اب یہ ادارہ سارے جہاں کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ اور یہ صرف اور صرف ربّ العالمین کی ملکیت ہے۔ اور کوئی بھی خاکی انسان اس پر اپنا حق ملکیت جتا نہیں سکتا۔ ورنہ میں قیامت کے دن اُس کا دامن پکڑوں گا۔ اور بارگاہ الٰہی میں اُسے کھڑا کروں گا۔

﴿ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لا يَكُوْنُوْا أَمْثَالَكُمْ. ﴾

چونکہ یہ علمی گلشن اللہ رب العزت کی ملکیت ہے لہذا وہی اس کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہے۔ بارِالٰہا! تو اس علمی امانت کو ہر قسم کے شرور وآفات اور نظر بد سے بچا کر اسے اپنی امان میں لے لے اور اس کا فیض تا قیامت جاری رکھ اور اس کے ذریعہ سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی خدمت کا سامان پیدا کر۔

﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ إِنَّکَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ، وَتُبْ عَلَيْنَآ إِنَّکَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ. ﴾

میری زندگی کے بعض وحشتناک واقعات

میں نے اپنی زندگی کے بہت سے اوراق کھول کر آپ کے سامنے رکھ دئے ہیں۔ لیکن ابھی بہت سے اوراق ایسے ہیں جو سربستہ رازوں کی حیثیت سے میرے سینے میں دفن ہیں، جن کو کھولنے میں مجھے فائدے سے زیادہ نقصان نظر آتا ہے، کیونکہ وہ نہ تو ملت کے مفاد میں ہیں اور نہ ہمارے خاندان کے مفاد میں۔ لہذا اُن کا راز ہی میں رہنا بہتر ہے۔ مگر پھر بھی میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میرے بچپن اور جوانی کے عالم سے طرح طرح کی آزمائشوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج بھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اب ایک وحشتناک قسم کے ابتلاء سے سابقہ پڑ گیا ہے، جس کی تفصیل بیان کرنے کی قلم میں تاب نہیں ہے۔ لیکن چونکہ یہ میری ذاتی اور نجی زندگی سے متعلق ہے اس لئے اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میرے بچپن اور جوانی میں بھی اس طرح کے دلخراش واقعات پیش آچکے ہیں، جنہوں نے میرے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنے بچپن اور جوانی کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان سب کو کڑوے گھونٹ سمجھ کر پی گیا ہوں۔ چونکہ مجھے نوجوانی کے عالم میں قرآن مل گیا تو وہی میری ساری توجہات کا واحد مرکز بن گیا۔ اور میں نے اپنے ذاتی واقعات کو بھلا کر کتاب الٰہی کی خدمت میں لگ گیا۔ ان بھیانک واقعات کی کچھ تفصیل اپنی ڈائریوں میں مذکور ہے۔ مگر ان کو پچاس سال بعد کھولنا مناسب ہوگا۔

بہرحال یہ سب کچھ تحریر کرنے کے بعد اب میرے ذہن کا بوجھ اُتر گیا ہے اور اب میں خود کو ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ اللہ رحم کرے میرے حالِ زار پر۔ یعنی مرنے تک بھی مجھے چین وسکون نصیب نہیں ہوا ہے۔ اب دیکھئے ابتلاء کا یہ سلسلہ کب تک چلتا ہے۔

نانی مرحومہ کی ایک وراثت

میرے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، جن میں سے تین لڑکوں اور تین لڑکیوں کی

شادیاں ہوچکی ہیں۔ان میں سے بعض کی مجھ سے یہ شکایت رہتی ہے کہ میں نے اُن کے لئے کچھ نہیں کیا ہے اور کسی کے لئے ایک مکان تک نہیں بنوا سکا ہوں اور میں نے اپنی ذاتی جائیداد تک بیچ کر اس راہ میں کیوں قربان کردی؟ آبائی مکان (چک باناور میں) اور اپنا ذاتی گھر (داسرہلی میں) اور اپنی دیگر زمینیں کیوں بیچ دیں؟ اب آپ کے بعد ہم کہاں جائیں گے اور کہاں رہیں گے؟ مگر ان سب باتوں کا میں ایک ہی جواب دیتا رہا کہ سب کا اللہ مالک ہے اور وہ کسی کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔بس قرآنی افکار کی تبلیغ اور اُن کی نشر واشاعت کی ایسی دُھن لگی رہی کہ کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔اب میں سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ قرآن مجید سے یہ جذبہء عشق غالباً مجھے ہماری نانی سے ملا ہوگا، جو ہمیشہ عشق الٰہی میں ڈوبی ہوئی تھی، حتیٰ کہ اُنہوں نے اسی عشق الٰہی میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔اگرچہ بندہ شرعی نقطۂ نظر سے اس قسم کے ''جذب'' کا قائل نہیں ہے، جو کسی کو اپنے بال بچوں تک سے غافل کردے، بلکہ میں اسے ایک قسم کی انتہاء پسندی ہی سمجھتا ہوں۔

بہرحال اس فقیر حقیر کو عشق قرآن کا جو جذبہ ملا ہے وہ عطیہء الٰہی تو ہے ہی، مگر یہ جذبہ مجھے وراثتاً اپنی نانی مرحومہ سے ملا ہے جو عشق الٰہی میں ڈوب کر فنا فی اللہ ہوچکیں، اور یہ نشہ ان کے سر سے مرتے دم تک اُتر نہیں سکا۔یہی حال اپنا بھی ہے کہ پورے پچاس سال گزر چکنے کے باوجود کتاب الٰہی کا نشہ اب تک برابر چھایا ہوا ہے۔حالانکہ یہ پورا عرصہ طرح طرح کے ہنگاموں سے بھرا رہا اور میرے قدم بارہا متزلزل ہونے لگتے، لیکن ہمیشہ تائیدِ غیبی حاصل رہی۔﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔﴾ (اللہ اچھا کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا)

یہ تو نانی مرحومہ کی ایک علمی وراثت ہے۔اس کے علاوہ مجھے موصوفہ کی طرف سے ایک مادی وراثت بھی ملی ہے، جو ایک کھیت کی شکل میں اس وقت چک باناور میں موجود ہے۔چنانچہ

ڈھائی ایکڑ کا یہ کھیت نانی نے میری والدہ کے نام ہبہ کر دیا تھا، اور اسے والدہ میرے نام ہبہ کر گئی ہیں۔ اور اب یہی ایک واحد چیز ہے جس کا میں مالک ہوں۔ ایک اور سائیٹ (قطعہ اراضی) مجھے والد صاحب کے ذریعہ ملا تھا جس پر اب ایک ہندو جعلسازی کے ذریعہ قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ یہ ہے میری کُل کائنات۔

رُوح اور قیامت کا ایک سائنٹفک ثبوت

کتاب کے آخر میں اس عنوان کو دیکھ کر آپ یقیناً چونک گئے ہوں گے کہ اپنے خاندانی تذکرہ کے بعد یہ کونسی تُک بندی ہے کہ یہ عنوان لے آئے؟ لیکن بات ہی کچھ ایسی ہے کہ اسے مجبوراً لانا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بندہ اپنی عمر کی ۷۳ ویں منزل سے گزر رہا ہے۔ اور جب سے میں نے یہ کتاب لکھنی شروع کی، تو رہ رہ کر مجھے وہ سب واقعات اور وہ سب باتیں ایک ایک کر یاد آ رہی ہیں جو ذہن و دماغ سے محو ہو چکی تھیں۔ یعنی شعور سے پوری طرح غائب ہو چکی تھیں۔ لیکن اب پچاس ساٹھ سال تک کی باتیں اچانک حاشیہ ذہن سے اُبھر اُبھر کر آ رہی ہیں اور بچپن کے وہ سارے مناظر بھی ذہن کے پردے پر رقص کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، جیسے ٹی وی اسکرین پر مختلف مناظر یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔

غرض تقریباً ایک ماہ سے میرے ذہن میں بہت سی باتیں اور یادیں "زندہ" ہو رہی ہیں جو تقریباً "مُردہ" ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک جدید سائنسی تحقیق یہ ہے کہ کسی بھی انسان کے جسمانی اجزاء و عناصر چند سال کے بعد پوری طرح بدل جاتے ہیں۔ یعنی انسان "عُنصری" اور "جوہری" اعتبار سے چند سال بعد بالکل "نیا" بن جاتا ہے۔ مگر اُس کی "شخصیت" جوں کی توں رہتی ہے، جسے کسی طرح کا دھکا تک نہیں پہنچتا۔ یعنی بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہر انسان وہی "انسان" رہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی "تبدیلی" نہیں ہوتی۔ اور اس سلسلے میں سائنسی نقطۂ

نظر سے ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ سائنس باوجود اپنی ہمہ گیر ترقی کے اب تک اس حقیقت کا پتہ نہیں لگا سکی ہے کہ انسان کا حافظہ دماغ کے کس حصے میں ہے؟ (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا آف اِگنورنس، ص ۲۰۶، مطبوعہ آکسفورڈ)۔ اس اعتبار سے انسان کی ''شخصیت'' اور اُس کا حافظہ دونوں ہی پُراسرار ہیں، جن کی حقیقت نا معلوم ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم عناصر میں کوئی ایسی چیز اثر انداز ہو رہی ہے جو عنصری و جوہری نہیں ہے۔ یہی چیز ''رُوح'' ہے جو ہر انسان میں ہمیشہ برقرار رہتی ہے اور وہ ''غیر فانی'' ہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دوبارہ پیکر عنصری عطا کر کے پھر سے اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اور عالم مظاہر میں اس طرح کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں جو حیات ثانی یا قیامت کی حقانیت پر دلیل ناطق ہیں۔ اسی لئے عالم مظاہر میں غور و فکر کرنے اور دلائل رُبوبیت کو کھوج نکالنے کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک مختصر ترین آیت کریمہ ملاحظہ ہو ﴿وَفِيٓ أَنۡفُسِكُمۡ أَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ﴾ اور خود تمہارے انفس (جسمانی نظاموں) میں بھی اللہ کی نشانیاں موجود ہیں، تو کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

واضح رہے رُوح ایک غیر مادی چیز ہے، جسے نہ تو تولا جا سکتا ہے، نہ ناپا جا سکتا ہے اور نہ ہی چھوا جا سکتا ہے۔ اسی لئے وہ اب تک سائنس کی ''گرفت'' میں نہیں آ سکی ہے۔ لیکن مادہ پرستوں کو تھک ہار کر اس کا اعتراف کسی نہ کسی دن ضرور کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کا انکار ایک ''زندہ حقیقت'' کا انکار ہے، جسے زیادہ دنوں تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ یہی وہ رُوح ہے جو دیکھتی ہے، سنتی ہے، محسوس کرتی ہے، علم و عقل کی قوتوں سے متصف ہے، سوچتی ہے، حافظہ رکھتی ہے، دلیل و استدلال سے کام لیتی ہے اور بحث و مباحثہ کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ جیسے ہی کسی ''جسم'' کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ چند اجزاء و عناصر کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے۔

اس لحاظ سے کسی انسان کی شخصیت اُس کا جسم نہیں بلکہ اُس کی رُوح ہے، جو اُسے

نچائے پھرتی ہے۔ چنانچہ سائنسی نقطۂ نظر سے یہ حقیقت تجرباتی طور پر پوری طرح ثابت ہوچکی ہے۔ لہذا اس حقیقت کا انکار ایک سائنسی حقیقت کا انکار ہے۔ غرض اس طرح ''بھولی بسری'' باتوں کا اچانک یاد آ جانا دراصل غافل انسانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ دیکھو تمہاری ''مری ہوئی'' باتیں جس طرح پھر سے ''زندہ'' ہورہی ہیں اسی طرح تم بھی مرجانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوجاؤ گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی پُر جلال ہستی اس عالم مظاہر کے اُس پار ضرور موجود ہے جو ان ''خاکی پُتلوں'' کو نچا رہی ہے۔ اور اُسی کے ہاتھ میں اس پوری کائنات کی باگ ڈور ہے۔

آخری بات

برسبیل تذکرہ، اس موقع پر یہ بھی بتاتا چلوں کہ عصر جدید میں قرآن اور سائنس پر تحقیقی کام کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ اس کی ایک مثال یہ بحث بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے حقائق گہرے غور وخوض کے بغیر ظاہر نہیں ہوسکتے۔ لہذا اس موضوع پر تحقیق وریسرچ کے لئے کئی افراد کو مل کر کام کرنا چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ عصر جدید میں اس قسم کی ایک نئی تفسیر لکھنے کی اشد ضرورت ہے جو خاص کر سائنسی مزاج رکھنے والوں کو متاثر کرسکے۔ قرآن حکیم کی تفسیر اور قرآنی علوم (قرآنیات) پر اب تک ہزاروں کتابیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن ہر دور میں غور وخوض کرنے والوں پر اس کتاب حکمت کے نئے نئے اسرار وحقائق منکشف ہوتے رہیں گے، جن کا اختتام کبھی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح قرآنی فکر اور اُس کی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے ''ندائے فرقان'' کی طرز کا ایک علمی وتحقیقی رسالہ جاری کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ اس سلسلے کے نتائج فکریہ کو اُمت کے سامنے لانے کا کام تسلسل کے ساتھ جاری رہ سکے۔ اور اس قسم کے رسالہ کو سہ ماہی یا شش ماہی

ہونا چاہیئے، تاکہ اس میں بھرتی کے مضامین شامل نہ کئے جاسکیں۔ اور اس کام کے لئے مجھ جیسے کسی دیوانے کو تلاش کرنا چاہیئے۔ بقول علامہ اقبال ع

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

بس مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا ہوں۔ لہذا اب اجازت چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔ ع

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

☆☆☆☆☆
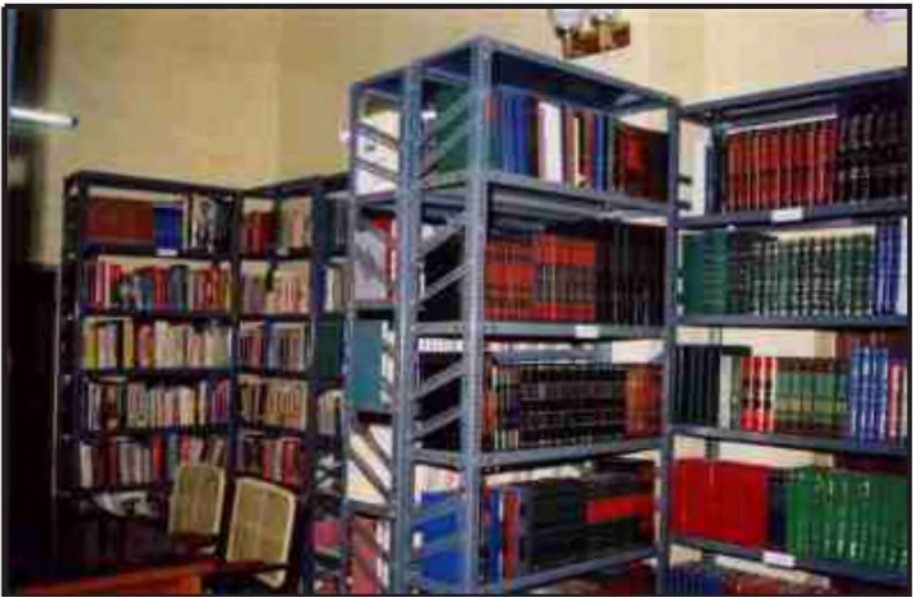
فرقانیہ اکیڈمی کی عظیم الشان لائبریری کے دو مناظر جواب ''علامہ شہاب الدین ندوی لائبریری'' کے نام سے موسوم کی گئی ہے۔

فرقانیہ اکیڈمی اور دارالشریعہ کی سابقہ عمارت

۱۹۹۸ میں قاہرہ میں ایک عالمی کانفرنس میں علامہ ندویؒ اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے

فرقانیہ اکیڈمی کی موجودہ مستقل عمارت کا ایک دلکش منظر

مجدد ملت حضرت علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ کی جملہ تصانیف

اردو کتابیں:

کلامیات:		قیمت	
۱- اسلام کی نشأۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں	(کراچی)	=/۳۰۰	روپئے
۲- بیالوجی قرآن کی نظر میں	(کراچی)	=/۱۰۰	
۳- قرآن حکیم اور علم نباتات		=/۱۵۰	
۴- تخلیق آدم اور نظریہ ارتقاء		=/۷۵	(نایاب)
۵- قرآن مجید اور دنیائے حیات		=/۲۵	
۶- اسلام اور عصر حاضر		=/۴۰	
۷- چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں		=/۴۰	(نایاب)
۸- قرآن، سائنس اور مسلمان		=/۳۵	
۹- اسلام اور جدید سائنس		=/۳۰	(نایاب)
۱۰- جدید علم کلام		=/۳۰	
۱۱- قرآن اور نظام فطرت		=/۴۵	
۱۲- قرآن عظیم کا نیا معجزہ اور علماء کی ذمہ داریاں		=/۲۵	
۱۳- اسلام میں علم کا مقام ومرتبہ		=/۴۰	
۱۴- قرآن کا پیغام		=/۲۵	

۱۵- اسرار نبوت	۵/=
۱۶- حیات ثانی کے عقیدے پر کلوننگ کی شہادت	(نایاب)
۱۷- سائنسی میدان میں مسلمانوں کا عروج وزوال	۱۵/=
۱۸- اکیسویں صدی کا جہاد: قرآن عظیم کے ذریعہ	۱۲/=
۱۹- اسلام اور جدید عالمی نظام	۴۰/=
۲۰- سورج کی موت اور قیامت	۳۵/=
۲۱- قرآن عظیم کا نظام دلائل	۶۰/=
۲۲- قرآن کا نظریہء علم	۶۰/=
۲۳- میری علمی زندگی کی داستان عبرت	۶۰/=
۲۴- خلافت ارض کے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت	۳/=
۲۵- قرآن کا پیغام ہندی مسلمانوں کے نام	(نایاب)
۲۶- چاند اور قیامت	(نایاب)
۲۷- قرآن کا فلسفہء کائنات اور اس کی ابدی سچائیاں	۴۰/=
۲۸- عالم ربوبیت میں توحید شہودی کے جلوے	۷۵/=

فقہیات ومعاشرتی مسائل:

۲۹- عورت اور اسلام	۲۵/=
۳۰- اسلام کا قانون نکاح	۷۵/=
۳۱- اسلام کا قانون طلاق	۳۵/=
۳۲- اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں	۳۰/=

۳۳- تین طلاق کا ثبوت	۱۰/=
۳۴- سپریم کورٹ کا فیصلہ	۱۵/=
۳۵- تعدد ازواج پر ایک نظر	۱۰/=
۳۶- ہمارے تعلیمی مسائل	۱۰/=
۳۷- اسلام میں زکاۃ کا نظام	۵/= (نایاب)
۳۸- زکاۃ کے مستحق کون ہیں؟ (حصہ اول)	۵۰/=
۳۹- زکاۃ کے مستحق کون ہیں؟ (حصہ دوم)	۵۰/=
۴۰- کیا زکاۃ علماء کو دی جاسکتی ہے؟	۵/=
۴۱- آسان عربی زبان (حصہ اول)	۱۰/=
۴۲- آسان عربی زبان (حصہ دوم)	۱۵/=
۴۳- جہیز ایک غیر اسلامی تصور	۲۵/=
۴۴- نکاح کتنا آسان کتنا مشکل؟	۱۰/= (نایاب)
۴۵- بیع مرابحہ اور اسلامی بنک کاری	۵۳/=
۴۶- جہیز خلاف شریعت کیوں؟	۱۰/= (نایاب)
۴۷- زکاۃ اور مصالح عامہ	۲۵/=
۴۸- زکاۃ کے اجتماعی نظام کی اہمیت	۵/=
۴۹- زکاۃ کے آٹھ مصارف اور فی سبیل اللہ	۸/=
۵۰- شریعت اسلامیہ کی جنگ: نفقہ مطلقہ کی روشنی میں	۲۵/=
۵۱- رویت ہلال کے لئے فلکیاتی حساب معتبر ہے یا نہیں؟	۱۲/=

۵۲- ہندستان میں ایک شریعت ہاؤس کی ضرورت واہمیت ۵/=

۵۳- نظریہء اشتراکیت ۵/=

۵۴- ہماری تعلیم کا مسئلہ ۵/=

۵۵- جہیز ایک سماجی فتنہ ۵/=

۵۶- جہیز کی شرعی حیثیت ۵/=

۵۷- اسلام نکاح ایک مسنون اور آسان طریقہ ۵/=

۵۸- تعلیم نسواں اسلامی نقطۂ نظر سے ۵/=

عربی کتابیں

۵۹- بین علم آدم والعلم الحدیث ۲۵/=

۶۰- الأدلة العلمية الحديثة على المعاد الجسدى ۲۰/=

۶۱- التجليات الربانية فى عالم الطبيعة ۷۵/=

۶۲- الاستنساخ الجينى يصدق المعاد الجسدى ۵/=

۶۳- نهضة العالم الإسلامى فى ظلال القرآن الكريم ۱۲۵/=

۶۴- أهمية الجهاد لنهضة العالم الإسلامى ۲۰/=

۶۵- التقدم في العلم والتكنولوجيا ۱۵/=

۶۶- الحاجة الى انشاء دار الشريعة فى الهند ۵/=

۶۷- مشاهد الربوبية في دنيا النبات ۵۰/=

۶۸- خلق آدم ونظرية التطور والارتقاء ۱۰۰/=

۶۹- أهمية علم الكيمياء والفيزياء ۳۵/=

۷۰- القرآن الكريم وعلم الكلام الحديث ۶۰/=

۷۱- ثبوت الهلال بين الحساب الفلكي والرؤية بالعين ۱۵/=

۷۲- نظرة على ذات الباری تعالی ۴۰/=

انگریزی کتابیں:

73- The Holy Qur'an and Biology 25/=
74- The Battle of Islamic Shariah in India 25/=
75- The Holy Qur'an and Natural World 75/=
76- Evolution or Creation? 125/=
77- Need to Institutionalise Zakat 5/=
78- Cloning Testifies Resurrection 5/=
79- Rise and Fall of Muslims in Science 18/=
80- Moon Sighting & Astronomical Calculations 15/=
81- Qur'an, Science and the Muslims 90/=
82- Shariah House A Basic Necessity 5/=
83- Death of the Sun and Doomsday 50/=

زیر طبع کتابیں

اردو کتب:

۱- تفسیر سورۂ تکویر: اور اُس کے اسرار و عجائب

۲- فطرت و شریعت میں مشابہت

۳- قرآن کی حجت عالم انسانی پر

۴- جدید علم کلام کیا ہے؟ ایک تعارف

۵- قرآن اور سائنس میں کیا تعلق ہے؟

۶- خلافت ارض کے لئے علم کیمیا اور طبیعیات کی اہمیت

۷- مصر کی اسلامی کانفرنس کی رپورٹ

۸- سفرنامہء مصر اور فرعونیات پر ایک نظر

۹- اسلامی شریعت کی معقولیت اور اس پر تحقیقی کام کی ضرورت

۱۰- اسلامی سیاست کے چند اُصول

۱۱- ماہیت باریٔ تعالیٰ پر ایک نظر قدیم وجدید نظریات کی روشنی میں

عربی کتابیں:

۱ – نظرة على تعدد الزوجات

۲ – موت الشمس ويوم القيامة

۳ – الشريعة الإسلامية في ميزان العلم والعقل

۴ – عبرات من حياتى العلمية

۵ – نظرية المعرفة القرآنية: في ضوء الاكتشافات الحديثة

۶ – نظام الأدلة القرآنية ونهضة الأمة الإسلامية

انگریزی کتب:

1- Qur'anic Code of Argumentation
2- Holy Qur'an and the Plant World
3- Dowry: An Un-Islamic Practice
4- Modern Ilmul Kalam
5- Grandeur of Knowledge in Islam
6- Polygamy: A General Overview
7- Islamic Code of Marriage
8- Marriage Between Simplicity & Complication
9- Islamic Code of Divorce

سوانح ھذا

☆ مجددِ ملت حضرت علامہ محمد شہاب الدین ندوی رح کی خود نوشت سوانح عمری وعلمی جسے حضرت رح نے اپنی وفات سے صرف ایک دن قبل مکمل کیا تھا۔

☆ یہ سوانح اس مردِ مجاہد کی داستانِ حیات ہے جو یقین محکم وعمل پیہم کا پیکر تھا۔اور جس نے اس دورِ انحطاط میں اسلامی عقائد و تعلیمات کو خود جدید سائنسی تحقیقات اور افکار کی روشنی میں فاتحانہ انداز میں ثابت کیا۔اور اعجاز قرآن اور جدید علم کلام کی تحقیق وتدوین کا علم بلند کرتے ہوئے اس میدان میں ایک عظیم تجدیدی کارنامہ انجام دیا۔

☆ علامہ علیہ الرحمۃ نے اس کتاب میں اپنے علمی وفکری ارتقاء، جدید مادی افکار و نظریات کے خلاف نبرد آزمائی اور خود اسلامی حلقوں میں علمی وفکری جمود کی داستان عبرت انگیز انداز میں بیان کی ہے۔

☆ یہ کتاب گزشتہ نصف صدی پر محیط اس عظیم قرآنی تحریک اور علمی جہاد کے احوال وکوائف پر مشتمل ایک دستاویز ہے۔